Overdue charges will be levied under rules for each day if the book is kept beyond the date stamed above.

ادبی کارنامے

مؤلفہ:- محمد صدیق ایم اے بی ٹی و سید ظہیر الدین علوی ایم اے

ادبی کارنامے

نظم

مؤلفہ

سید ظہیر الدین احمد علوی ایم اے (اردو) ایم اے (فارسی)
لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

و

محمد صدیق ایم اے بی ٹی (علیگ)
اسسٹنٹ ماسٹر آف لینگویج اسلامیہ انٹر کالج جونپور

پبلشر
مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ
۱۹۵۰ء

قیمت عہ

مقدّمہ

"ادبی کارنامے" دو حصّوں پر مشتمل ہیں۔

مؤلفین نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایسے مضامین اور نظموں کا انتخاب ہو جو ظاہری دلچسپی کے علاوہ طلبہ کے لئے علمی حیثیت سے مفید بھی ہوں۔

اس امر کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ انتخاب کے ذریعہ قدیم شعرار کے ذہنی ارتقاء کا نقشہ سامنے آجائے اور جدید شعرا کے رجحان کا بھی پتہ لگ سکے۔ چنانچہ دورِ قدیم اور دورِ جدید کے تمام مشہور مصنفین اور مستند شعرا کے انتخابات درج ہیں۔

انتخاب کی تازگی کا نفسیاتی اثر نہایت خوشگوار ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نفسیاتی اثر تعلیمی اور ادبی نقطۂ نظر سے نہایت مفید اور مستحسن ہوتا ہے۔

اس انتخاب میں شعرار اور مصنفین کے ایسے کلام اور مضامین درج ہیں جن سے اس کی خصوصیات علٰحدہ علٰحدہ سمجھ میں آسکیں۔

ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ طلبہ اور اساتذہ کریں گے۔

"مؤلفین"

فہرست

غزلیات

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں بالعموم عاشقانہ جذبات نظم کیے جاتے ہیں علاوہ عاشقانہ مضامین کے تصوف کے مضامین اخلاقی باتیں بھی بعض شعرا نے غزل میں بیان کی ہیں۔ غزل کے لئے جذبات کی شدت اور بیان کی سادگی درکار ہے۔ سوز و گداز بھی اس کا بنیادی عنصر ہے پھر غزل کا مختصر ہونا ضروری ہے۔ بعض شعرا نے طویل غزلیں لکھی ہیں۔ لیکن ۲۱ شعر سے زیادہ لکھنے کا رواج بہت کم رہا ہے۔

غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ باقی اشعار کو بیت غزل اور آخری شعر کو جس میں شاعر تخلص بھی نظم کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔ ایک مطلع سے زیادہ مطلع کہنے کا بھی رواج ہے اور اگر ایک غزل کے بعد ایسی ردیف اور قافیہ کی پابندی سے دوسری غزل لکھی جائے تو اسے دوغزلہ کہتے ہیں۔ بعض شعرا نے سہ غزلہ چہار غزلہ بھی لکھا۔ غزل گو شعرا ہیں: ولی۔ حاتم سودا۔ میر۔ درد۔ میر حسن۔ مصحفی۔ انشا۔ جرات۔ ناسخ۔ آتش۔ امیر داغ۔ حسرت۔ اصغر۔ فانی۔ جگر۔ عزیز۔ آرزو۔ اور ثاقب نمایاں ہیں۔

مرزا رفیع سودا

مرزا رفیع سودا کے آباد اجداد کابلی ہیں جہاں سے تجارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے۔ دہلی میں مرزا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی جوانی کے زمانہ میں دہلی شعر و شاعری کا مرکز تھا۔ شاہ حاتم جو اپنے آپ کو ولی کا شاگرد کہتے تھے اردو شاعری کی بزم کی رونق تھے سودا انھیں کے شاگرد ہوئے اور بہت جلد اس قدر مشق بہم پہنچائی کہ خود استادوں میں شمار ہونے لگے جب دلّی ویران ہوئی اور یہاں کے شعرا دوسرے شہروں میں جانے لگے تو سودا بھی نواب شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے۔ باقی ایام وہیں فارغ البالی میں بسر کئے اور ۱۱۹۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

سودا کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر قصیدے اور ہجو کی طرف مائل ہوئے اور دونوں میں ایسا کمال بہم پہنچایا جو انھیں کا حصہ ہے۔ انھیں اُردو کا انوری کہا جاتا ہے کیونکہ انوری نے فارسی شاعری کی تاریخ میں قصیدہ اور ہجو کو اپنا فن خاص قرار دیا ہے۔ غزل کے لئے طبیعت میں سوز و گداز ضروری ہے۔ سودا اس سے محروم تھے پھر بھی انھوں نے استادوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی اُن کے مضامین میں جدت اور الفاظ و تراکیب میں ندرت پائی جاتی ہے۔

اُن کے متعلق ایک ناقد کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ "کلام کا زورِ مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی" ان سب باتوں پر بندش کی چستی جس کی طرف اس عہد میں توجہ ذرا کم تھی اُن کے یہاں بہت نمایاں ہے۔

(۱)

اسباب سے جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں
پہ فکر تو نہیں کہ یہ ہے اور وہ نہیں

گو منتظر دعا کا ہمارے ہے اب قبول
دست و دہن پسارئیے اپنی یہ خو نہیں

آنکھیں تو ایسی خلق نہ ہوئیں ہیں نہ ہوئیں گی
پر چاہیے کہ اُن میں مروت ہو سو نہیں

باندھا ہم اس چمن میں اگر آشیاں تو کیا
ہے گل میں آب و رنگ وفا کی تو بو نہیں

سرگوشی پر تو میرے یہ آشفتہ کیوں ہوا
میں دردِ دل کہا ہے یہ کچھ اور تو نہیں

جو چاہیں یار حال سے دیں میرے اشتہار
پروا کچھ ایسی باتوں کی اُس شوخ کو نہیں

سوداؔ نہ کرتے کاش ترا وصف پیش یار
اب ہم کو اُس سے آنکھ ملانے کا رو نہیں

(۲)

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کیونکر نہ چاک چاک گریبانِ دل کروں
دیکھوں ہوں تیری زلف کو میں دست شانے میں

زینت دلیل مفلسی ہے ٹک کماں کو دیکھ
نقش و نگار چھوٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں

اے مرغِ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول
تو کنے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانے میں

دستِ نگر کشا کو نہ تزئیں کرے فلک
مہندی بندھی نہ دیکھی میں انگشت شانے میں

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

(۳)

مجمر کا دخل کیا ہے محفل میں تفتگاں کی
بو داغِ دل کی اپنے ہم عود جانتے ہیں

اپنا چراغ دل کا جس دم سے بجھ گیا ہے
ہم گھر کو آسماں کے پُر دود جانتے ہیں

آئینہ سازی اُن کو ہی کفر اے سکندر
جو مرد شکل ہستی نابود جانتے ہیں

جس خشت کو اُٹھا کر دیکھیں وہ چشم دل سے
صورت کو اپنی اُس میں موجود جانتے ہیں

کیا شکر کیا شکایت اپنی ہی شکل ہے ہے
دونوں سے آپ کو ہم مقصود جانتے ہیں

عجز و غرور دونوں اپنی ہی ذات میں ہیں
ہم عبد سے جُدا کب معبود جانتے ہیں

ہم سر نوائیں کس کے آگے کہ بیدآسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

(۴)

دل سنت ٹک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائے گا

رخصت ہے باغباں! کہ ٹک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

پہنچیں گے اس چمن میں نہ ہم داد کو کبھی
جوں گل یہ چاک جیب سلایا نہ جائے گا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

عمامہ کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ
سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا

ظالم میں کہہ رہا تھا کہ اس خو سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

دامانِ داغ تیغ جو دھویا تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ مٹایا نہ جائے گا

(۵)

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

کہتا ہے آئینہ کہ سمجھ تربیت کی قدر
جن نے کیا ہے سنگ کو ہم رنگ آب کا

تھا کس کے دل کو کشمکش عشق کا دماغ
یا رب بُرا ہو دیدۂ خانہ خراب کا

زاہد سبھی ہیں نعمت حق جو ہے اکل و شرب
لیکن عجب مزا ہے شراب و کباب کا

غافل غضب سے ہو کے کرم پر نظر نہ رکھ
پُر ہے شرار برق سے دامن سحاب کا

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

اے برق کس طرح سے میں حیراں ہوں تیرے پاس
نقشہ ہی ٹھیک دل کے مرے اضطراب کا

سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر اک ذرہ میں ہے آفتاب کا

میر محمد تقی میرؔ

میر تقی اُردو شاعری میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ غزل گو شعرائے کے سرتاج ہیں۔ ان کی شنوائی اُردو میں اپنے رنگ کا پہلا نمونہ ہیں قصیدہ گوئی کی طرف بھی مائل ہوئے لیکن یہ فن ان کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتا تھا اس لئے اپنے ہمعصر حریف مرزا سوداؔ سے وہ اس میدان میں پیچھے رہ گئے۔ میرؔ کی زندگی کے حالات اب سے چند سال پہلے تک بحث طلب اور اختلافی تھے لیکن اُن کی خود نوشتہ سوانحعمری "ذکرِ میرؔ" کی اشاعت سے بہت سے تصفیہ طلب مسائل طے ہو گئے۔ جدید ترین تحقیقات کی بنا پر اُن کی پیدائش اکبر آباد (آگرہ) میں ۱۱۳۶ ہجری میں ہوئی۔ والد کا نام محمد علی تھا جو ایک صوفی منش بزرگ تھے میر صاحب نے تصوف کی تعلیم اُن سے ہی حاصل کی اس لئے بچپن سے درویشوں اور صوفیوں کی صحبت پسند ہوئی بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا۔ سوتیلے بھائیوں اور عزیزوں نے ان کے ساتھ محبت کا سلوک نہیں کیا اس لئے دل برداشتہ ہو کر دہلی چلے آئے اور اپنے عزیز سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے پاس رہنے لگے۔ خاں آرزو فارسی اور اردو کے زبردست شاعر تھے اور اردو کے اکثر شاعر اُن کے شاگرد تھے۔ اس ماحول میں میر صاحب کو بھی شعر گوئی کا شوق ہوا اور دہلی میں اس کا آغاز ہوا۔ تھوڑے

عرصہ کے بعد خان آرزو سے اَن بَن ہو گئی اور یہ زمانہ ان پر بہت سخت گزرا، تلاشِ معاش میں دربدر بھٹکتے پھرے آخر کار دہلی کو الوداع کہا اور نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ چلے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں بھی تیرہ بختی نے اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا، آخر عمر نہایت عسرت اور تنگدستی میں بسر ہوئی۔ ذکر میر کے خاتمہ کی عبارت پڑھنے سے آج بھی دل بھر آتا ہے۔ میر صاحب اپنے آلام اور مصائب کا ذکر کرتے ہوئے دردناک انداز میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں۔ اُن کی یہ آرزو ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں پوری ہوئی۔ لکھنؤ میں ہی دفن ہوئے لیکن مرنے کے بعد بھی یہ بدنصیبی قابلِ غور ہے کہ ان کے مزار کا پتہ نہیں بعض لوگوں نے بزرگوں کی روایات سن کر آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چبوترے پر اُن کا مزار بنا دیا ہے۔ لیکن اُن کے کلام کو جو شہرت اور قبول عام حاصل ہوا وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں اور کسی کو نصیب نہیں۔

اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی سادگی ہے۔ زبان سادہ اور بیان سادہ کا جو نمونہ ان کے کلام میں ملتا ہے وہی سہل ممتنع ہے اس وصف خاص میں کسی شاعر کا کلام ان سے بازی نہیں لے جا سکا لیکن اس سادگی نے کلام کو پھیکا اور بے مزہ نہیں کیا۔ جوش ان کی شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت ہے۔ اور اسی لئے ہر شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے ان کے کلام پر رائے دیتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ اُن کا کلام تیز نشتر کی طرح ہے جو فوراً دل کی گہرائی

میں پہنچ کر کھٹکنے لگتا ہے، ان کی زندگی آلام اور مصائب میں گزری تھی اس لئے قدرتی طور پر یاس و حسرت کے مضامین ان کے کلام میں بکثرت ہیں۔ دنیا کے بے ثباتی اور ناپائیداری کے جیسے نادر مضامین ان کے یہاں ملتے ہیں اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ تصوف سے گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے عشق حقیقی اور معرفت الٰہی کے مضامین اُن کے کلام میں اور بھی گرمی اور تیزی پیدا کرتے ہیں۔ ان مضامین میں بھی سوائے ایک خواجہ میر درد کے کوئی اُن کے پایہ کو نہیں پہنچا۔ شاعری میں ان کے ان کمالات کو قدیم و جدید شاعروں نے تسلیم کیا ہے اس اعتبار سے اپنے کلام کے متعلق اُن کی یہ پیشینگوئی سچ ثابت ہوئی۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

(۱)

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

قطعہ

کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

(۳)

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ باز پسیں تھا
شب کوفتِ ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا تھا — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا — جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خراباتِ نشیں تھا

(۴)

یہ میرِؔ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — اندازِ سخن کا سببِ شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اُس کا — منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا — ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک — آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا
غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے — وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا
گو میرؔ جہاں میں کنھوں نے تجھ کو نہ جانا — موجود نہ تھا تو۔ تو کہاں نام و نشاں تھا
دن جی کے اُلجھنے ہی کے جھگڑے میں کٹے ہے — رات اُس کے خیالات سے رہتے ہیں قضایا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو — خضر آب اُسے کہتا ہے آتش کہے موسیٰ

جب نے فرمہ کرتی ہی صدا چبھتی ہی دل میں
بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

(۴)

لطف اگر یہ ہی نہاں اصندلِ پیشانی کا — حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا
کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لئے — حسن، زنار ہے تسبیح سلیمانی کا
درہمی حال کی ہی سارے مرے دیواں میں — سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا
جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا — تنگ احوال ہی اس یوسف زندانی کا
کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں — ہی بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا
اُس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں — نقش کا سا ہی سماں میری بھی حیرانی کا

بُت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میرؔ ایسی مسلمانی کا

(۵)

دل کی بات کہی نہیں جاتی، چپکے رہنا ٹھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا ٹھانا ہے
دل جو رہے تو پاؤں کو بھی دامن میں ہم کھینچ رکھیں
صبح سے لیکر سانجھ تلک اودھر ہی آنا جانا ہے
سُرخ کبھو آنسو ہیں ہوتے زرد کبھو ہے منہ تیرا
کیا کیا رنگ محبت کے ہیں یہ بھی ایک زمانہ ہے

اس نومیدی بے غایت پر کس مقدار کڑھا کرے
دو دم جیتے رہنا ہے تو قیامت تک مرجانا ہے
فرصت ہے یاں کم رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانا ہے
فائدہ ہوگا کیا نتریتب ناصح ہرزہ سرائی سے
کس کی نصیحت کون سنے ہے عاشق تو دیوانا ہے
تیغ تلے ہی اس کے کیوں نہ گردن ڈال کے جا بیٹھیں
سر تو آخر کار ہمیں بھی خاک کی اور جھکانا ہے
آنکھوں کی یہ مردم داری دل کو کسو دلبر سے ہے
طرز نگاہ کی طراری ساری میر تمہیں پہچانا ہے

خواجہ میر درد

ان کا نام سید خواجہ میر اور تخلص درد تھا ۱۷۰۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے سلسلہ نسب مشہور بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبندی تک پہنچتا ہے۔ چونکہ خاندان میں صوفیانہ ماحول پہلے سے موجود تھا یہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ شاعری اور فقر و استغنا دونوں چیزیں ورثہ میں ملی ہیں۔ جوانی میں ہی تقریباً تارک الدنیا ہو کر اپنے والد کے سجادہ پر رونق افروز ہوئے اور عرصہ تک لوگوں کو ہدایت دیتے رہے ۱۷۸۵ء میں دہلی ہی میں وفات پائی۔

قدیم اردو شاعروں کے کلام میں عام طور پر ناہمواری پائی جاتی ہے یعنی بعض اشعار نہایت بلند اور بعض نہایت پست ہیں۔ چنانچہ میر تقی میر تک کا کلام اس عیب سے خالی نہیں۔ ان کے برخلاف خواجہ میر درد کا کلام اگرچہ مختصر ہے لیکن انتخاب ہی یعنی اس میں ہر شعر نہایت بلند اور پاکیزہ ہے تصوف اور عشق حقیقی کے مضامین اُن کے کلام کا خاص موضوع ہیں اس لئے دنیا کی بے ثباتی توکل فقر و استغنا اور پاکیزگی نفس کی تعلیم جیسی اُن کے کلام میں ملتی ہے اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے، زبان نہایت سادہ استعمال کرتے ہیں اور غزلیں بالعموم چھوٹی بحر میں لکھتے ہیں۔

(۱)

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بُت خانہ تھا ہم سبھی مہماں تھے واں اک تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ
وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر
دردؔ یہ مذکور کیا ہے، آشنا تھا یا نہ تھا

(۲)

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے

جوں شرارے ہستیٔ بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

(۳)

مجھے در سے اپنے تو ٹالے ہے یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں
کوئی اور بھی ہے ترے سوا تو اگر نہیں تو جہاں نہیں

پڑی جس طرف کو نگاہ یاں نظر آ گیا ہے خدا ہی واں
یہ ہیں گو کہ آنکھوں کی پتلیاں مرے دل میں جائے بتاں نہیں
مرے دل کے شیشہ کو بیوفا تو نے ٹکڑے ٹکڑے ہی کر دیا
مرے پاس تو وہی ایک تھا یہ دکان شیشہ گراں نہیں
مجھے رات ساری ہی تیرے یاں کٹے کیونکہ روئے نہ شمع ساں
کہ نہ ہو سکے ہی کچھ اب بیاں یہ وہ بات ہے کہ زباں نہیں

(۴)

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا
تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا — پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری — جی میں یہ کس کا تصور آ گیا
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات — پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا
پی گئی کتنوں کا لوہو تیری یاد — غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا
مٹ گئی تھی اُس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تو چونکا گیا

(۵)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں — ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
سر تا قدم زباں ہیں جوں شمع گو کہ ہم — پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں نا قبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے دردؔ آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

غلام ہمدانی نام اور مصحفیؔ تخلص تھا۔ ۱۷۵۰ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے انھوں نے اپنے حالات خود فارسی کے ایک تذکرہ میں لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ والد کا نام شیخ ولی محمد تھا جو امروہہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس زمانہ میں دلی ارباب کمال کا مرجع تھی یہ بھی تحصیل علم کے شوق میں پہنچے اور شعر و شاعری کی محفلوں میں شریک ہوئے۔ وہاں رہ کر فارسی اور عربی کی اعلیٰ استعداد بہم پہنچائی یہاں تک کہ عربی میں قصیدہ لکھنے پر قادر ہوئے لیکن خیال گزرا کہ اب یہ زبانیں رفتہ رفتہ اٹھتی جا رہی ہیں اس لئے اردو کی طرف توجہ کی، خود اپنے مکان پر مجلس مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس میں اُن کے مشہور ہمعصر شعرا میر حسنؔ، انشاؔ، جراتؔ وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ جب دہلی ویران ہوئی اور دوسرے شعرا نے اس سرزمین کو خیرباد کہا تو مصحفیؔ بھی نکلے۔ کچھ دنوں ٹانڈہ میں رہے پھر لکھنؤ پہنچے، چند روز قیام کے بعد دہلی واپس ہوئے لیکن لکھنؤ کی کشش نے پھر بلا لیا وہاں پہنچ کر شاہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

اسی دربار میں انشاؔ سے اور اُن سے معرکے ہوئے جس میں انشاؔ نے ہجو سے ان کی توضیح کی دونوں کے شاگردوں نے اس معرکہ کو اور بھی گرم کیا اور اس سلسلہ میں بعض ناخوش گوار واقعات پیش آئے لیکن بعد میں مصالحت ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد مصحفیؔ نے شاعروں کا جو تذکرہ لکھا ہے اس میں اس کی طرف بالکل اشارہ نہیں ملتا ۱۸۲۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اُردو غزل میں میر تقی میرؔ کے بعد ان کا درجہ ہے۔ یہ اس دور میں لکھنؤ پہنچے جب نئے رنگ کے آثار پیدا ہو چلے تھے لیکن انھوں نے اپنے کلام میں شاعری کے اصلی عناصر سادگی، اصلیت اور جوش کو قایم و برقرار رکھا، مضمون سادہ اور بیان سادہ میرؔ کی طرح ان کے کلام میں بھی خاص جوہر ہے، کبھی کبھی مشکل زمینوں میں بھی غزل کہتے ہیں لیکن استادی کی شان اس میں بھی نمایاں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب انشاؔ اور رنگین کی شاعری سوسائٹی کے اثر سے مبتذل اور فحش ہونے لگی تھی، مصحفیؔ نے متانت سنجیدگی اور پاکیزگی کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ غزل کے علاوہ قصیدے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ میرؔ کی مشہور مثنوی دریائے عشق کو دوبارہ "بحر المحبت" کے نام سے نظم کیا۔ غزل میں آٹھ دیوان یادگار ہیں۔ جن کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ اور بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

(۱)

کیا جانے کیا کرے گا یہ دیدار دیکھنا ایک دن میں آئینہ اُسے سو بار دیکھنا

تنہا ہے جا بھڑا صفِ مژگانِ یار سے کیا روز ہے یہ دل بھی جگردار دیکھنا

یاں حسن کو ہے عشق سے آفت لگی ہوئی — ظالم کوئی نہ ہو جو طرحدار دیکھنا
کھینچے ہیں اپنی اپنی طرف زلف و خال و خط — کتنے ہیں ایک دل کے خریدار دیکھنا
شاکی ہیں اُس کے جان و دل و دیدہ سب بہم — کس کس کے ہے وہ درپئے آزار دیکھنا
جب دیکھا ہم نے اُس کو تو مر مر کے ہم بچے — یعنی ہمیں نہیں ہے سزاوار دیکھنا
جاتے ہیں ان کے ساتھ چلی جان عاشقاں — ان خوشقدوں کی خوبی رفتار دیکھنا
ق
اے مصحفی میں تجھ سے کہوں طرفہ ماجرا — سنتا ہے اس طرف کو ٹک اے یار دیکھنا
لیکن بشرط آنکہ تجھے میری ہی قسم — کیجو کسی سے اس کو نہ اظہار دیکھنا
کچھ ان دنوں میں آگے کے نسبت تیرا رفیق — بے طرح ہو چلا ہے بد اطوار دیکھنا
باور نہیں ہے تجکو اگر یہ میرا سخن — تو آپ جا کے تو بشبِ تار دیکھنا
چھیڑے ہے اُس کو غیر تو کہتا ہے اُس سے یوں — کوئی کھڑا نہ ہو پس دیوار دیکھنا
پس اس طرح ہی یکدگر اُس ستمگر کے تئیں — ہے ہر کسی سے گرمی بازار دیکھنا
اپنی طرف سے ہم تو میاں تجکو کہہ چکے — ٹک تو بھی اپنے دل میں تو یکبار دیکھنا
یا تو تو اپنے دام میں لا اس کو صبح و شام — یا جا کے کوئی اور طرحدار دیکھنا

(۲)

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم — حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا
شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا — وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے — ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا
مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا — کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

(۳)

عشق مجھے اہلِ بصر کر گیا — اشک کے قطرے کو گہر کر گیا
رہ گئے ہم سوتے ہی افسوس ہے — قافلہ صبح سفر کر گیا
آگیا میں سامنے اُس کے تو وہ — دیکھ مجھے نیچی نظر کر گیا
آکے مری خاک پہ گل گردباد — دیر تلک خاک بسر کر گیا
دل نہ لگا اُس کا کہیں ایکبار — جو ترے کوچے سے گذر گیا
یار میرے سر سے گذرا تو کیا — یار کا خنجر تو گذر کر گیا

(۴)

دنیا میں جب تلک کہ میں اندوہگیں رہا — دل غم سے اور دل سے مرے غم قریں رہا
رونے سے کام بسکہ شب اے ہمنشیں رہا — آنکھوں پہ کھینچتا میں سر آستیں رہا
نازک مزاج تھا میں بہت اس چمن کے بیچ — جب تک رہا تو خندہ گل سے حزیں رہا
آخر کو ہو کے لالہ اُگا تو بہار میں — خونِ شہیدِ عشق نہ زیرِ زمیں رہا
رکھوں میں دل کیونکہ دل اپنے کو مصحفی — میرے کہے میں اب تو میرا دل نہیں رہا

(۵)

جو پلٹ کے اُس نے منہ کو تو نقاب اُلٹا — ادھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا
نہ قفس میں ایسے مجھکو تو اسیر کیجو صیاد — کہ گھڑی گھڑی وہ ہووے دمِ اضطراب اُلٹا
میرے حال پر مغاں نے یہ کرم کیا کہ ہنس ہنس — میرے ننگے سر پہ رکھا قدحِ شراب اُلٹا
ترا تشنہ شب جہاں سے جو گیا پر اُس کی — پس مرگ بھی کسی نے نہ سبوئے آب اُلٹا
مری آہ نے جو کھولی نقشون اشک سے برقا — وہیں برق رعد لیکر علم سحاب اُلٹا
جو خیال میں کسی کے شب ہجر سو گیا ہو — نہ ہو صبح گو الٰہی کبھی اُس کا خواب اُلٹا
میرے دم اُلٹنے کی جو خبر اُس کو دی کسی نے — وہیں نیم رہ سے قاصد بصد اضطراب اُلٹا

امام بخش ناسخ

ان کا نام امام بخش اور تخلص ناسخ ہے۔ ان کے والد کے متعلق بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ لاہور کے ایک خیمہ دوز تھے۔ بعض نے تجارت پیشہ بتایا ہے۔ بہر حال ناسخ کی ولادت فیض آباد میں ہوئی جو اس زمانہ میں سلطنت اودھ کا مرکز تھا۔ تاریخ ولادت کے بارہ میں اختلاف ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت جو فیض آباد میں ہوئی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی زمانہ میں یہ لکھنؤ پہنچے اور وہاں متعدد رئیسوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ آغا میر وزیر السلطنت خاص طور پر ان کے محسن تھے۔ ان درباروں میں رہ کر ناسخ نے شعر و شاعری کا مذاق پیدا کیا اور بقدر ضرورت عربی فارسی کی تحصیل کی۔

اس زمانہ میں دہلی جو اب تک اُردو شاعری کا مرکز تھی ویران ہو گئی۔ سیاسی انتشار نے دہلی کے مشاہیر شعرا کو ترک وطن کے لئے مجبور کیا، چنانچہ سب سے پہلے شجاع الدولہ کے عہد سراج الدین علی خاں آرزو دہلی سے ہجرت کر کے فیض آباد آئے۔ ان کے بعد مرزا رفیع سودا، جعفر علی حسرت، حیدر علی حیراں، ضاحک، میر حسن، انشا، مصحفی یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ ان کے آنے سے یہاں بھی ہر وقت شعر و شاعری کا چرچہ رہنے لگا۔ لکھنؤ کی نئی سلطنت وجود میں آ رہی تھی اور قدرتی طور پر لکھنؤ والے ہر چیز میں اہلِ دہلی پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ شعر و شاعری میں بھی انھوں نے دہلی کے رنگ

سے علیحدہ اپنا خاص انداز پیدا کیا۔ ناسخ پہلے شخص ہیں جنھوں نے باضابطہ اس کی کوشش کی۔

ناسخ بحیثیت شاعر میر یا سودا کا مقابلہ نہیں کر سکتے' اوّل تو ان کا رنگ اُن سب سے جدا ہے۔ پھر ان کی توجہ شاعری میں مضمون سے زیادہ زبان وبیان پر صرف ہوتی تھی۔ اُن سے پہلے بھی اُردو زبان کی اصلاح میں بعض شعرا مثلاً حاتم، سودا، میر نے کوشش کی تھی لیکن باقاعدہ توجہ سب سے پہلے ناسخ نے کی۔ اُن کی بدولت بہت سے الفاظ اور سبک تراکیب سے اُردو کا دامن مالامال ہو گیا۔

شاعری میں ان کا رنگ خارجی ہے یعنی عشق ومحبت کے بیان میں جذبات نگاری کی جگہ وہ متعلقات حسن اور محبوب کے ظاہری لوازم بیان کرتے ہیں جس سے شاعری کا زور کم ہو جاتا ہے۔ پھر خیال بندی بھی ان کے کلام کا خاص طرہ ہے۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور اُن سے تازہ مضامین پیدا کرتے ہیں۔ اخلاقی مضامین بھی جابجا موجود ہیں اس لئے بحیثیت مجموعی اُنھیں اُردو شعرا کی صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے خاص طور پر اصلاحِ زبان میں اُن کی کوشش یادگار ہے۔
اُن کے خاص شاگرد علی اوسط رشک تھے جنھوں نے استاد کے اصولوں کو اپنے کلام میں خوب برتا ہے۔

(۱)

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں دلِ پر داغ کو کیونکر ہے عشق اُس زلفِ پیچاں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا
وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا
چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا
کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا
مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

(۲)

جو دل ہی ٹوٹ گیا کیا ہوں شعرِ تر پیدا ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا
نہ داغِ یاس سے گھبرا یہ آئے گی امید گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا
پس از وفات بھی تاثیرِ گریہ باقی ہے مرے غبار سے ہوتا ہے ابرِ تر پیدا
ستارۂ سحری ہے اگر ترا دُرِ گوش ہوئی ہے تیری بناگوش سے سحر پیدا

خدا کے کام کچھ آلات پر نہیں موقوف
ابو البشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

(۳)

پیکِ فرخندہ فال آ پہونچا پھر پیامِ وصال آ پہونچا

پھر مبارک ہو صحبت ساقی — موسم برشگال آپہونچا
چشم بے نور ہوگئی پر نور — کیا وہ یوسف جمال آپہونچا
اُڑکے اب جائیگی کہاں بطے
ابر باراں کا جال آپہونچا

(۴)

تو نے مہجور کر دیا ہم کو — سخت رنجور کر دیا ہم کو
دل بنا عاشقی میں خودمختار — اور مجبور کر دیا ہم کو
ایسی تعریف کی کہ اے واعظ — عاشق حور کر دیا ہم کو
ہو گیا ہے نشۂ عرفاں — نار سے نور کر دیا ہم کو
تھے تو مقہور ہونے کے لایق
یار سے مغفور کر دیا ہم کو

(۵)

دل اک بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے — خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے
یہ جوش شراب اس برس ہے کہ ساقی — فلک مثل مینا ہوا چاہتا ہے
بطا مے کو پہونچائے کوئی یہ مژدہ — رواں مے کا دریا ہوا چاہتا ہے
گذر اُس پری کا ہے اکثر چمن میں — درختوں کو سایا ہوا چاہتا ہے
جنوں ضعف اگر یوں ہی زنجیر پا ہے
تو زنداں بھی صحرا ہوا چاہتا ہے

خواجہ حیدر علی آتش

ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا، آبا و اجداد دلی کے باشندہ تھے لیکن خواجہ علی بخش ترک وطن کرکے فیض آباد چلے آئے جہاں ۱۷۶۷ء میں خواجہ حیدر علی پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے تعلیم و تدریس کی تکمیل نہ ہو سکی اور آخر تک یہ کمزوری باقی رہی۔ والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ پہنچے، اور مصحفی کے شاگرد ہوئے یہ ایسے شاگردوں میں ہیں جن سے اُستاد کا نام روشن ہوا۔

ناسخ ان کے ہمعصر تھے، دونوں کی اُستادی مسلم ہوئی لیکن دونوں کا رنگ جدا جدا ہے۔ مصحفی کے وسیلہ سے آتش کے یہاں، دہلوی شاعری کی بعض خصوصیات راہ پا گئی ہیں جن کی وجہ سے کلام میں زور اور گرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے یہاں ناسخ کی طرح خیال بندی اور مضمون آفرینی نہیں ہے۔ خارجی مضامین ہیں لیکن کم۔ ان کی بجائے تصوف کے مضامین کی چاشنی ہے جو لکھنوی شعرا کے یہاں عام طور پر نہیں ملتی ہیں۔

انھوں نے سوائے غزل کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی، اس زمانہ میں دربار کی وجہ سے ہر شاعر کسی نہ کسی حد تک قصیدہ گوئی کے لئے مجبور تھا، انھوں نے قصیدہ گوئی سے اپنی زبان آلودہ نہیں کی، توکل اور استغنا کی زندگی بسر کرکے ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔

ان کے شاگردوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم بہت مشہور ہوئے جو مثنوی گلزار نسیم کے مصنف ہیں۔

(۱)

غبار راہ ہو کر چشم مردم میں محل پایا
نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

برنگ شمع ہم دلسوختوں نے بزم عالم میں
زباں کھولی نہ لیکن بات کرنے کا محل پایا

نظر آتے ہیں خال عنبریں گرد لب لعلیں
سیاہ زنگ نے شہر بدخشاں میں عمل پایا

غم فرقت سے عمر رفتہ گذری بیقراری میں
تری امداد سے آرام ہمنے اے اجل پایا

ہمیشہ جوش گریہ سے رہا پانی میں اے آتش
کبھی تازہ نہ لیکن اپنے دل کا یہ کنول پایا

(۲)

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

طبل و علم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

(۳)

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

نہیں ہے وجہ ہنسنا اس قدر زخم شہیداں کا
تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب

بناوٹ کیف مے سے کھل گئی اُس شوخ کی آتش
لگا کر مُنہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

(۴)

نکلتی کس طرح ہے جان مضطر دیکھتے جاؤ
ہمارے پاس سے جاؤ تو پھر کر دیکھتے جاؤ

نسیم نوبہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں
تماشائے گُل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ

جدہر جاتے ہو ہر گھر میں سے یہ آواز آتی ہے
مسیحا ہو جو بیماروں کو دم بھر دیکھتے جاؤ

قدم انداز سے باہر ہوئے جاتے ہیں صاحب کے
ستم رفتار میں کرتی ہے ٹھوکر دیکھتے جاؤ

روش مستانہ چلتے ہو قدم مستانہ پڑتے ہیں
خدا کے واسطے پھر ہمیں دیکھتے جاؤ

نقاب اک دن اُلٹ کر تم نے یہ منہ سے فرمایا
جمال آفتاب ذرہ پرور دیکھتے جاؤ

نہ پھیرو اُس سے مُنہ آتش جو کچھ درپیش آجاوے
دکھاتا ہے جو آنکھوں کو مقدر دیکھتے جاؤ

شیخ ابراہیم ذوقؔ

والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ سنہ ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے حافظ غلام رسول ان کے استاد ہوئے۔ انھوں نے علاوہ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم کے شاعری کا مذاق بھی پیدا کر دیا۔ کیونکہ حافظ صاحب خود شاعر تھے اور ہر وقت ان کے یہاں شعر و شاعری کا چرچہ رہتا تھا۔ ابراہیم ذوقؔ نے پہلے حافظ صاحب کو اپنا کلام دکھایا، پھر شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ شاہ نصیر اس عہد میں دہلی کے ناسخ کہلاتے تھے اور اُن کا رنگ عام طور پر بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ذوقؔ نے وہی انداز اختیار کیا جس کی بدولت ولی عہد سلطنت ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا عیش و عشرت اور فارغ البالی کی زندگی بسر کر کے سنہ ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ مرنے سے کچھ پہلے یہ شعر نظم کیا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ذوقؔ ہر فن مولا تھے، موسیقی، نجوم، رمل اور طب میں انھیں خاص دخل تھا یہی وجہ ہے کہ علمی اور فنی اصطلاحیں اُن کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔

ذوقؔ کا خاص میدان قصیدہ ہے لیکن سوداؔ کی طرح غزل میں بھی ان کا مرتبہ مسلم ہے۔ اُن کی غزلیں بالعموم رنگین ہوتی ہیں جن میں زبان

اور محاورہ کی کشش نمایاں ہے۔ یہی وہ اثر ہے۔ جو انھوں نے اپنے اُستاد شاہ نصیر سے ورثہ میں پایا ہے۔ زبان کی صفائی اور لذت بیان نے ان کے اشعار کو نہایت آبدار بنا دیا ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال اُن کے اشعار میں بکثرت ہیں اور ان سب میں بے تکلفی اور چستگی پائی جاتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی تلاش میں انھیں خاص ملکہ تھا جس سے ان کا کلام اور زیادہ آراستہ نظر آتا ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب ان کے ہمعصر بلکہ حریف تھے لیکن دونوں کا رنگ علیحدہ علیحدہ ہے۔ مرزا صاحب مشکل پسند تھے۔ اُن کے مضامین مشکل اور انداز بیان نرالا ہے۔ ذوق کے یہاں سادگی اور سلاست ہے۔ اس لئے دونوں کو اپنے اپنے رنگ کا استاد اور مالک سمجھنا چاہیے مولانا محمد حسین آزاد نے جو ان کے شاگرد تھے اپنی مشہور تصنیف آب حیات میں ان کے حالات کو تشریح و تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور کلام پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

(۱)

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دل بد خواہ میں تھا مارنا یا چشم بد بیں میں
فلک پر ذوق تیر آہ گر مارا تو کیا مارا

(۲)

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا
مقدر ہی یہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
سُراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیونکر — کہیں جس کا نشان پایا نہ پایا
رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے — نکل جاتے۔ مگر رستا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا۔ لبِ گویا نہ پایا

(۳)

ستم کو ہم کرم سمجھے جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت سے خدا سمجھے
رواں ہوتا ہی اس بستاں سرا سے کاروانِ گل — چٹکنے کو صبا غنچے کے آوازِ درا سمجھے
حساب اپنا صلا نہ پوچھے مجھ سے میرے ٹکڑے زخموں کا — حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے
نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا — مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اُسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

(۴)

وقتِ پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

تجکو رسوا کریں گی، خوب بدل تیری یہ اضطراب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں
ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوقؔ
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

(۵)

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ تم بھی چلے چلو یونہیں جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

مرزا اسد اللہ خاں غالب

نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرزا اسد اللہ خاں جن کا لقب مرزا نوشہ تھا اردو شاعروں کی صف اول میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی ولادت اکبرآباد (آگرہ) میں ۱۷۹۶ء میں ہوئی، والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا جو الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت میں تھے ۱۸۰۱ء میں کسی لڑائی میں کام آئے اور مرزا کو داغ یتیمی نصیب ہوا۔ والد کے انتقال کے بعد چچا نصر اللہ بیگ خاں نے پرورش کی لیکن اُن کا بھی چند سال بعد انتقال ہو گیا، اُن کی پنشن میں سے مرزا کو بھی اپنا حصّہ ملا۔

مرزا کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی دختر سے دہلی میں ہوئی، اس تعلق سے برابر دارالسلطنت میں آنا جانا ہوتا رہا اور آخر کار دہلی وطن قرار پایا، یہاں شاعری اور اُن کے کمالات نے بہت جلد انھیں بلند ترین مراتب تک پہنچا دیا تا آنکہ ۱۸۵۴ء میں ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے انھیں اپنا استاد مقرر کیا اور علاوہ خلعت کے پچاس روپئے ماہوار وظیفہ منظور ہوا ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے چرکے سہے، اس زمانہ میں فکر معاش نے انھیں بیحد پریشان رکھا، دربار رامپور کے ماہانہ عطیہ اور قرض ادھار پر گزر کرتے رہے۔ دوڑ دھوپ کے بعد پنشن جو زمانہ غدر میں بند ہو گئی تھی دوبارہ جاری ہو گئی ۱۸۶۹ء میں دہلی میں ہی وفات پائی اور بستی

نظام الدین اولیار میں دفن ہوئے۔

مرزا اُردو شاعروں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کا رشتہ براہ راست فارسی شعرا سے جوڑا، اپنے کلام کے پہلے دور میں وہ اُردو شاعری اور شعرا کی روایات سے بالکل بیخبر نظر آتے ہیں اور فارسی کے مشہور شعرا مثل بیدل و صائب، کلیم و ظہوری کا اپنی نظم و نثر میں تتبع کرتے ہیں خاصکر مرزا بیدل کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس کے بعد ایک دور ایسا گزرا کہ اُردو کا کلام بہت کم لکھا، لیکن ۱۸۵۰ء میں ظفر کی استادی کا شرف حاصل ہوتے ہی شاعری پر ایک نیا اثر پڑا، قلعہ معلیٰ میں استاد ذوق مرحوم کی بدولت شاہ نصیر کا رنگ مقبول تھا۔ انھیں بھی وہی انداز اختیار کرنا پڑا لیکن طبیعت غیور اور جدت پسند تھی اس لئے شاعری میں اپنی شاہراہ بہت جلد الگ نکال لی۔

مرزا غالب کے کلام کی سب نمایاں خوبی خیال کی بلندی ہے، اس میں جہاں کہیں وہ حد سے تجاوز کرتے ہیں کلام مغلق ہو کر معمہ بن جاتا ہے۔ دورِ اول میں ایسے نمونے بکثرت ملتے ہیں، لیکن جہاں سلامتی طبع اُن کا ساتھ دیتی ہے اور بلند پروازی میں اعتدال ملحوظ رہتا ہے وہاں اُن کا کلام نادر ہوتا ہے وہ فارسی کے عاشق تھے اس لئے فارسی کی نزاکت اور شیرینی اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش ہر جگہ نظر آتی ہے۔ بالخصوص بہت سی نئی ترکیبیں اور تشبیہیں جو پہلے پہل انھوں نے استعمال کی ہیں اس زبان میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

لیکن غالب کے کلام کا اصلی جوہر وہاں کھلتا ہے جہاں وہ دنیا کے حقائق و معارف اور فطرت انسانی کے وسیع مطالعہ سے اپنے تاثرات نظم کرتے

ہیں۔ یہی حصہ اُن کے کلام کا غیر فانی عنصر ہے۔ اس میں سوز و گداز بھی ہے اور طنز و ظرافت بھی، تصوف بھی ہے اور دنیا کے مسائل پر فلسفیانہ اور مفکرانہ غور و فکر بھی، رندی و شاہدی کے مضامین بھی ہیں اور اخلاق و پند و نصائح کے دفتر بھی، غرض ان کے ساز میں ہر راگ اور راگ میں ہر بول ہے غالباً ایسی جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن کے بعض ناقدین نے دیوان غالب کو ہندوستان کی ایک الہامی کتاب قرار دیا ہے۔

آج کل غالب کی روز افزوں شہرت نے منکرین کی ایک جماعت پیدا کر دی ہے جو اُن کے کلام کو سرتاپا مہمل قرار دیتی ہے۔ اس جماعت میں زیادہ تر ایسے حضرات شامل ہیں جو اُردو شاعری کو مغربی بالخصوص انگریزی شاعری کے معیار پر جانچتے ہیں اور غالب کا مقابلہ مشہور انگریز شعرا شیکسپیر، ورڈ سورتھ، بائرن، شیلی، اور کیٹس سے کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنا انصاف سے بعید ہے، ہمیں ہر شاعر کے کلام کو پڑھتے وقت اس کے زمانہ اور ماحول کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، کسی دوسرے ماحول اور زمانہ کے پس منظر میں اس کی شاعری یقیناً عجیب نظر آئے گی۔

(۳)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۴)

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

(۳)

درد منت کش دوا نہ ہوا / میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو / اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں / تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب / گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی / آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی / بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی / حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما / کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے / لے کے دل دلستاں نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(۴)

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا / آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا / اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں / کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد / ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا / بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی / گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوانمرد بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

(۵)

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن غبارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

حکیم مومن خاں مومن

حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے ۱۸۰۰ء میں دہلی میں ولادت ہوئی اور وہیں
تعلیم و تربیت ہوئی۔ عربی فارسی کے علاوہ طب و نجوم اور دوسرے علوم متداولہ
میں پورا دخل رکھتے تھے، شاعری کی ابتدا کی تو شاہ نصیر کے شاگرد
ہوئے بعد میں اپنا انداز خاص پیدا کر لیا۔ نہایت نازک مزاج، نفاست پسند
اور وضعدار تھے، ۱۸۵۱ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی طرح ان کی طبیعت بھی مشکل پسند تھی، لیکن
دونوں کی مشکل پسندی میں فرق ہے۔ مرزا کا مضمون بالعموم مشکل ہوتا ہے اس
لئے قدرتی طور پر انداز بیان کی سادگی کے باوجود شعر سمجھنا مشکل ہوتا ہے مومن کے
کلام میں مضامین خالص عاشقانہ اور سادہ ہیں لیکن طرز ادا میں پیچیدگی انھیں
پسند ہے۔ اس وجہ سے اُن کے اکثر اشعار نہایت مشکل نظر آتے ہیں اور بعض
معمہ یا چیستان بن کر رہ گئے ہیں۔ عاشقانہ مضامین میں انھوں نے زیادہ توجہ
خالص عشق مجازی کی طرف کی ہے تصوف جو اُردو غزل کے خمیر میں شامل ہے
اُن کے یہاں موجود نہیں لیکن خیال کی نزاکت و ندرت اور بیان کی لطافت نے
کلام میں ہر جگہ تازگی پیدا کر دی ہے تشبیہات اور استعارات کے انتخاب میں وہ مرزا غالب
کی طرح منفرد ہیں اور مقطعے میں اپنے تخلص مومن کی رعایت سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

غزل کے علاوہ انھوں نے قصیدے اور مثنویاں بھی لکھی ہیں، لیکن شہرت
کا دار و مدار غزل پر ہی ہے۔ جس سے اُن کی علمیت، شاعرانہ قدرت اور
لطافت طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو — دست عاشق رسا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(۲)

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں — بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
ہم کچھ تو یاد تھے جب نہ کیا یار نے پسند — اے حسرت اس قدر غلطی انتخاب میں
بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے — اب عذر کیا رہا نگہ بے حجاب میں
مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا — حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں
ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں — پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں
دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش — وہ خط ہی اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
تقریر بھی بری مری تقدیر بھی بری — بگڑے وہ پرسش سبب اجتناب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع — مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

(۳۱)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ ذکر کئی سال کا کہ کیا ایک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنؔ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(۳۲)

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

پھبتی مری وحشت پہ ہی کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

(۵)

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں یہ — اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ
کچھ شور محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو — ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکیں یہ
حسرت سے کہا خضر نے دیکھا اس کی گلی کو — مرتا ہوں ابھی گر ملے مدفن کو زمیں یہ
گیا یار کے آنے کی سنی سمجھے کہ اجل کی — کاہے کی خوشی ہجر میں ہے جان حزیں یہ
ہاں کاہے کو وہ آنے لگا اے کشش دل — تو لاکھ کہے پر کوئی آتا ہے یقیں یہ
بیدم سا پڑا تھا کوئی اس کوچہ میں اس نے — دروازہ میں آ جھانک کے دیکھا جو کہیں یہ

اس رحم کے صدقے وہیں گھبرا کے کہا ہاں
جا کر کوئی دیکھو کہیں مومن تو نہیں یہ

امیر مینائی

منشی امیر احمد امیر مینائی ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، والد کا نام مولوی کرم علی تھا جن کا سلسلہ نسب حضرت شاہ مینا صاحب سے ملتا ہے۔ یہ خاندان لکھنؤ میں علم و فضل، زہد و تقویٰ اور شرافت کے لئے ممتاز تھا، شاعری میں ان کا تعلق مصحفی سے ہے۔ کیونکہ ان کے استاد امیر اسی سلسلہ میں ہیں۔ کچھ عرصہ تک امیر مینائی نواب واجد علی شاہ کے دربار سے متوسل رہے لیکن اُن کے مٹیا برج چلے جانے کے بعد طرح طرح کی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے آخر کار رامپور پہنچ کر ملازمت اختیار کی، رامپور اس وقت اُردو شعرا کا مرکز تھا، نواب مرزا خاں داغ دہلوی بھی اس وقت موجود تھے، امیر و داغ میں خوب صحبتیں رہیں جن کی وجہ سے امیر کے کلام پر ایک خوشگوار اثر پڑا، داغ رامپور کے بعد حیدر آباد چلے گئے اور انھیں کی دعوت پر آخر زمانہ میں امیر نے رامپور چھوڑنے کے بعد حیدر آباد کا قصد کیا لیکن نواب صاحب سے ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی کہ ۱۹۰۰ء میں پیغام اجل آپہنچا۔

امیر مینائی کے مجموعہ کلام میں غزلوں کے علاوہ قصیدے اور مثنویاں بھی ملتی ہیں لیکن اُن کی شہرت کا دار و مدار زیادہ تر ان کی غزلوں اور کسی قدر قصیدوں پر ہے۔ غزل میں اُن کے کلام کا ابتدائی حصہ خالص لکھنوی رنگ میں ہے یعنی زبان و بیان کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ مضامین اثر سے

خالی ہیں۔ لیکن رکاکت یا ابتذال جو اس عہد کے لکھنوی شعرا میں عام طور
پر ملتا ہے ان کے یہاں نہیں ہے، دوسرے دور کا کلام داغ کے رنگ
سے متاثر ہے اس میں حسن و عشق کے بیان کے ساتھ ساتھ زبان و محاورہ
کی شوخی اور خیالات کی رنگینی کا اضافہ ہو گیا ہے۔

(۱)

سرد آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا
چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا

جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور
جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آگیا

تن سے باہر آکے دھیان آیا عدم کا روح کو
قید سے چھٹ کر مسافر کو وطن یاد آگیا

نزع میں سنگیں دلی کا حال شیریں پر کھلا
موت کی سختی اٹھائی کوہکن یاد آگیا

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر میں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا

(۲)

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

ترے ناوک ادا سے کبھی ہارتا نہ ہمت
جگر اس سے آگے ہوتا جو جگر کے پار ہوتا

شب وصل تو جو سمجھو نہ ہوا امیر جو کا
ترے آنے کا کبھی تو اسے انتظار ہوتا

(۳)

مرجع و شرار ہے دنیا
کتنی بے اعتبار ہے دنیا

داغِ غم سے کوئی دل نہیں خالی
کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا

ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع
ہر حصہ کارزار ہے دنیا

آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار
سخت ناپائدار ہے دنیا

ایک جھونکے میں ادھر سے ادھر
چار دن کی بہار ہے دنیا

بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

(۴)

گلشن میں سرو قد جو مثلِ نشاں رہے
عالم میں سربلند رہے ہم جہاں رہے

حاتم کا داستانوں میں اب تک ہے تذکرہ
وہ کام کر کہ نام دلوں میں نشاں رہے

گلشن میں مجھ سے ہی یہ تقاضائے اضطراب
کھٹکا ہوں جس شجر میں وہیں آشیاں رہے

یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہو گئے تمام
کشتی میں جیسے ساکنِ کشتی رواں رہے

اب دیکھیں کیا دکھائے نشیب و فرازِ دہر
اب تک تو ہم زمیں پہ تلے آسماں رہے

نواب مرزا خاں داغ دہلوی

نواب مرزا خاں المتخلص بہ داغ دہلوی نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ نے ولیعہد سلطنت مرزا فخرو کے ساتھ نکاح کر لیا اور اس وسیلہ سے داغ کا قلعۂ معلیٰ سے تعلق ہو گیا۔ قلعہ میں اس وقت استاد ذوق کا سکہ رواں تھا، یہ بھی اُن کے شاگرد ہوئے اور مشق شاعری بہم پہنچائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں یہ بھی دہلی سے نکلے اور رامپور پہنچے جہاں نواب یوسف علی خاں کی قدردانی سے ارباب کمال کا مجمع تھا۔ مدتوں یہ رامپور میں رہے اور اپنی شعر و شاعری کے زور سے ایک رنگ پیدا کر دیا۔ آخر زمانہ میں حیدرآباد چلے گئے اور حضور نظام کے استاد مقرر ہوئے وہیں ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔ موجودہ دور میں قدیم رنگ کی شاعری کے علمبردار مثلاً احسن مارہروی نوح ناروی وغیرہ انھیں کے شاگرد ہیں۔

داغ کے کلام میں غزلوں کے علاوہ قصیدے اور مثنویاں بھی شامل ہیں لیکن ان کی شہرت کا باعث غزلوں کے چار دیوان ہی ہیں۔ ان میں عشق و عاشقی کی حکایات اور پر لطف واردات نظم ہیں۔ روزمرہ کی صفائی اور محاورہ بندی میں اردو کے کم شاعر اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مضمون اور زبان دونوں میں ندرت اور شوخی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اُن کے کلام میں کہیں کہیں مبتذل مضامین بھی آ جاتے ہیں۔ لیکن بہت کم، بحیثیت مجموعی مرزا داغ اردو شعرا کی صفِ اوّل میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱)

جب جوانی کا مزہ جاتا رہا — زندگانی کا مزا جاتا رہا
وہ قسم کھاتے ہیں اب ہر بات پر — بدگمانی کا مزا جاتا رہا
خواب میں تیری تجلی دیکھ لی — لن ترانی کا مزا جاتا رہا
کوئی تجھ پر بے غرض مرتا نہیں — جانفشانی کا مزا جاتا رہا

داغ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

(۲)

بیٹھے اداس اُٹھے پریشان خفا چلے — پوچھے تو کوئی آپ سے کیا آئے کیا چلے
آئیں گی ٹوٹ ٹوٹ کے قاصد پر آفتیں — غافل ادھر اُدھر بھی ذرا دیکھتا چلے
ہم ساتھ ہو لئے تو کہا اُس نے غیر سے — آتا ہے کون اس سے کہو یہ چلا چلے
بالیں سے میری آج وہ یہ کہکے اٹھ گئے — اس پر دوا چلے نہ کسی کی دعا چلے
بیٹھا ہی اعتکاف میں کیا داغ روزہ دار — اے کاش میکدہ کو یہ مرد خدا چلے

(۳)

ناروا کہئے ناسزا کہئے — کہئے کہئے مجھے بُرا کہئے
آپ اب میرا منہ نہ کھلوائیں — یہ نہ کہئے کہ مدعا کہئے
وہ مجھے قتل کر کے کہتے ہیں — مانتا ہی نہ تھا یہ کیا کہئے
دل میں رکھنے کی بات ہے غم عشق — اس کو ہرگز نہ برملا کہئے
تجھکو اچھا کہا ہے کس کس نے — کہنے والوں کو خیر کیا کہئے

مجھکو کہئے بُرا نہ غیر کے ساتھ — جو ہو کہنا جُدا جُدا کہئے
آ گئی آپ کو مسیحائی — مرنے والوں کو مرحبا کہئے
ہاتھ رکھ کر وہ اپنے کانوں پر — مجھ سے کہتے ہیں ماجرا کہئے
ہوش جاتے رہے رقیبوں کے — داغ کو اور با وفا کہئے

(۴)

فغاں کو لاگ ٹھہری آسماں سے — اُٹھا جاتا ہے پردہ درمیاں سے
تری رنجش کھلی طرزِ بیاں سے — نہ تھی دل میں تو کیوں نکلی زباں سے
گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے — چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے
وہ مجھ کو دیکھ کر بولے الٰہی — بچانا اس بلائے ناگہاں سے
تمہارے در پہ ہم کیونکر نہ آتے — کہ تھی صاحب سلامت پاسباں سے
وہ خط لکھیں مجھے جھوٹا ہے قاصد — خدا جانے اُٹھا لایا کہاں سے
جہاں آباد ہر منزل ہوئی داغ — قدم باہر نکالا جب مکاں سے

(۵)

جہاں میں کیا نہ ڈھونڈا کیا نہ پایا — مزاج اُن کا دماغ اُن کا نہ پایا
تری جانب ہی پھر جاتی خدائی — مگر کافر تجھے اتنا نہ پایا
ترے دستِ حنائی میں بھی ہے چور — کسی کو ہاتھ کا سچا نہ پایا
خزاں ہی خوب تھی بہرِ نشیمن — چمن میں ایک بھی تنکا نہ پایا

شفارش ہم تری کرتے پر اے داغ
کچھ اُن کا تجھ سے رخ اچھا نہ پایا

حسرت موہانی

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص قصبہ موہان ضلع اناؤ کے رہنے والے ہیں ۱۸۷۵ء میں ولادت ہوئی ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ چلے آئے بی۔اے کی ڈگری لی۔ علمی اور سیاسی جدوجہد کا آغاز بھی علی گڑھ میں ہوا جہاں سے انھوں نے مشہور رسالہ اردوئے معلیٰ نکالا۔ بی۔اے کے بعد بھی عرصہ تک علی گڑھ میں قیام رہا لیکن سیاست میں عملی دلچسپی بڑھ جانے کے باعث وہاں سے کانپور چلے آئے۔

حسرت اپنے انداز شاعری میں میر اور مصحفی کے ہم رنگ ہیں، اپنے متعلق خود کہا ہے۔ ع ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود۔

غزل میں مضامین عاشقانہ، جذبات بسیط، اور زبان سادہ استعمال کرتے ہیں، درد، یاس و حسرت، سوز و گداز جو لازمہ عاشقی ہیں ان کے کلام کی اثر آفرینی کا باعث ہیں، اکثر غزلیں مسلسل اور چھوٹی بحر میں لکھتے ہیں تصوف سے طبیعت کو خاص لگاؤ ہے جس کی وجہ سے عاشقانہ مضامین اور معاملہ بندی کی پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔

حسرت کی کامیابی کا ایک راز وسعت نظر اور کثرت مطالعہ میں مضمر ہے انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اردو شعراء کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ انتخاب سخن کے نام سے انھوں نے قدیم و جدید اردو شعراء کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب شائع کیا ہے۔

(۱)

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں میں مرتبے — مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

کیوں نہ ہو تیری محبت سے منور جان و دل — شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطف یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

(۲)

سرگرم بزم آپ کی شان جفا ہے کیا — باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

کر جوش آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی — میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار — عشق فدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرار دل — ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بام یار سے ہے نردبان عشق — اے دل یہ جائے حوصلہ ہے دیکھتا ہے کیا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر — یہ دیکھئے تمہاری شان عطا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہ فنا کی طرف رواں — تیری محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تم وفا
آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

(۳)

شوق پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا — داغ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا

دل کچھ ایسے ڈھب سے لئے ہیں کہ برسوں کوئی — حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

غلبۂ حق کا زمانے میں ہے اک شور بپا — اس پر افسوس جو بیدار نہ ہونے پایا

شادماں تھا جو ترے رنج طرب کا رسے دل — غم دنیا سے گرانبار نہ ہونے پایا

وصل میں بھی رہی بیگانگی حزم و حجاب — راستہ شوق کا ہموار نہ ہونے پایا

اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا — خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

ہم بھی سمجھیں گے ہوس عشق بتاں کو حسرتؔ
حل جو یہ عقدۂ دشوار نہ ہونے پایا

(۴)

جو راہِ عشق میں ترا پائمال ہو نہ سکا — وہ باریاب مقال کمال ہو نہ سکا

وہ جب ملے تو مجھے شادمانِ غم پایا — مرے ملال سے اُن کو ملال ہو نہ سکا

قبول سب نے وہی کی سنی جو آپ سے بات — کسی کو حوصلۂ قیل و قال ہو نہ سکا

وہ ابتدائے محبت وہ انتہائے غرور — کہ جس میں پڑ کے خیال مآل ہو نہ سکا

حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا حسرتؔ
سلام کر نہ سکے ہم سوال ہو نہ سکا

فانی بدایونی

شوکت علی خاں فانی ضلع بدایوں کے مردم خیز خطہ میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے آبا و اجداد کابل میں رہتے تھے جہاں سے نواب بشارت خاں شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور صوبہ بدایوں کے گورنر مقرر ہوئے۔ ایک بڑی جائداد معافی انھیں عطا ہوئی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں نکل گئی ان کے والد شجاعت علی خاں صاحب انسپکٹر پولیس تھے۔ انھوں نے اپنی محنت سے نیک نامی اور فارغ البالی حاصل کی۔ فانی نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں پائی پھر بریلی کالج اور آخر کار علی گڑھ پہنچ کر تکمیل کی۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا لیکن طبعاً مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے کئی مرتبہ کوشش کرنے کے بعد ارادہ ترک کردیا۔ عمر بھر پریشانی اور ناکامی کا ساتھ رہا۔ عمر کا آخری حصہ حیدرآباد میں گزارا لیکن الم نصیبی نے وہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی عالم میں ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد میں ہی پیام اجل آیا اور انھوں نے اس دارالمحن سے نجات پائی۔

فانی، میر اور غالب کا مجموعہ ہیں۔ میر کی طرح الم پرست اور یاس نصیب غالب کی طرح بلند تخیل اور اعلیٰ فکر کے مالک، ذاتی حالات اور واقعات نے زندگی کی تلخیوں کو اور بھی شدید کردیا تھا۔ اس لئے ان کا کلام ان کے درد دل کی تصویر ہے۔ اس میں رنگینی اور رعنائی کی جگہ مایوسی اور ناکامی کی کارفرمائی ہے۔ زبان بھی اسی مناسبت سے سادہ اور دلنشیں استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے انھیں موجودہ دور میں "یاسیات کا امام" کہا جاتا ہے۔

(۱)

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حُسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

اب اسے دار پہ لیجا کے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

دل سے پہنچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

(۲)

جمال خود رُخِ بے پردہ کا نقاب ہوا
نئی ادا سے نئی وضع کا حجاب ہوا

ملا ازل میں مجھے میری زندگی کے عوض
وہ ایک لمحۂ ہستی کہ صرف خواب ہوا

سکونِ قلب میسر ہی موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمۂ رنج و اضطراب ہوا

وہ جلوہ منتِ نظر تھا نظر کو کیا کہئے
کہ پھر بھی ذوقِ تماشا ناکامیاب ہوا

اُلٹ گئی مری اُمید و بیم کی دنیا
یہ کیا نظامِ تمنا میں انقلاب ہوا

گناہگار سہی دل مگر قصور معاف
ظہورِ شوق بہ اندازۂ حجاب ہوا

قضا کو مژدۂ فرصت کہ فانیؔ مہجور
شہیدِ کشمکشِ صبر و اضطراب ہوا

(۳)

ہوش ہی نہ دوش کا فکرِ مآل رہ نہ جائے
خلوتِ یادِ یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے

عشق ہی جب جنوں تو پھر شاد ہو اے دلِ حزیں
کوئی گلہ اٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے

تابِ نظارۂ جلال حشر میں بخش کر مجھے
شانِ جمال بھی دکھا شانِ جمال رہ نہ جائے

عجز اِدھر اُدھر غرور دونوں غیور سے غیور
دامنِ مدعا سے دور دستِ سوال رہ نہ جائے

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال
زخمِ جگر پہ خاک ڈال پھر یہ سنبھال رہ نہ جائے

نزع میں دو ادا سے اب نہ حیا کو راہ دے
عہدِ کرم تباہ دے پرسشِ حال رہ نہ جائے

فانیٔ نارِ جانبری عشق میں مصلحت نہیں
جان تو داغِ دل کے بعد ہنس کے وبال رہ نہ جائے

(۴)

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی

کہتے ہیں حسن ہی کی عبادت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی سے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

فانی دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

عزیز لکھنوی

مرزا محمد ہادی نام اور عزیزؔ تخلص ۵ ربیع الاوّل سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، والد کا نام مرزا محمد علی ہے جو اپنے زمانہ میں فضل و کمال کے اعتبار سے بڑا پایہ رکھتے تھے، خاندان کا علمی مذاق کئی پشتوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ عزیزؔ نے بھی اس سنت خاندانی کی تکمیل کی اور بہت متعدد اُستادوں سے جن میں مولوی محمد حسین صاحب مولوی سید لطف حسین صاحب مولوی سید ابو الحسن صاحب بیابانی مرزا صاحب مولوی شیخ فدا حسین صاحب بلگرامی، آغا سید محمد صاحب حاذق کے نام قابل ذکر ہیں، تحصیل علم کی، ان بزرگوں سے صرف و نحو، فقہ و اصول، ادبیات کتب معقول و درسیات فارسی کی تکمیل کی اس لئے شاعری کے ساتھ ساتھ علمی فضل و کمال کے جوہر بھی رکھتے تھے۔

عزیزؔ لکھنو کے قدیم رنگ تغزل کی آخری یادگار تھے، شاعری میں نئے رجحانات سے متاثر نہیں ہوئے اپنے ہمعصر ثاقبؔ کی طرح غالبؔ و میرؔ کی شاعرانہ عظمت کے مداح اور معترف ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں، تاہم ان کا اپنا خاص رنگ ہے جس میں غالبؔ کے خیال کی گہرائی میرؔ کا سوز و گداز اور ان کی سادہ زبان ایک نئے سانچے میں ڈھالی گئی ہے۔ چونکہ کم و بیش ایک صدی کی کوشش سے اساتذہ لکھنؤ نے نسخ و اصلاح کی مسلسل کوششوں سے زبان کو ہموار شستہ

ورفتہ کر دیا تھا۔ اس لئے عزیز کو لکھنؤ کی مستند اور ٹکسالی زبان ملی اسی میں انھوں نے اپنے خیالات ادا کئے ہیں۔ علاوہ غزل کے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان کے قصائد میں وہی زور اور طنطنہ ہے جو سودا اور ذوق کے ہاں ہے لیکن عزیز کی زبان ان دونوں سے صاف اور رواں ہے اُردو میں صرف غالب اور میر کا رنگ عزیز کو پسند ہے۔ اور فارسی میں عرفی و نظیری کو سامنے رکھتے ہیں

(۱)

خیال بھی ادھر اب لے خدا نہیں جاتا — مریض غم کا تصور کیا نہیں جاتا
بیان حرمت صہبا سہی مگر اے شیخ — تری زبان سے اس کا مزا نہیں جاتا
ہر اک قدم ترے کوچہ میں ایک عالم ہے — کہاں تک اب میں چلوں گا چلا نہیں جاتا
ہجوم شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے — کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا
زباں بیان کرے مدعائے دل کیونکر — کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا
وہ سرزمین جہاں پر مزار ہے میرا — ادھر سے اب کوئی درد آشنا نہیں جاتا

عزیز حال دل زار سامنے اس کے
کہوں تو لاکھ مگر کچھ کہا نہیں جاتا

(۲)

خدا محفوظ رکھے عشق کے جذبات کامل سے — زمیں گردوں سے ٹکرائی جہاں دل مل گیا دل سے
ہلی جاتی ہے دنیا رنگ مجلس میں تغیر ہے — یہ دامن جھاڑ کر کون اُٹھ گیا ہے آج محفل سے
حجاب ناز سے آراستہ ہو کر نہ یوں نکلو — ابھی واقف نہیں اچھی طرح تم رنگ محفل سے
ہمیشہ سے مزاج حسن میں دقت پسندی ہے — مری دشواریاں آساں ہوئیں سخت مشکل سے

پھر اٹھے اہل دل آئیں گے دنیائے محبت میں | گریں گے جتنے قطرے خون کے شمشیر قاتل سے
کسی کی بزم میں جا کر وہی ناکامیاں ہونگی | نتیجہ کیا دل بیتاب اس تحصیل حاصل سے
کیا مجنوں نے نالہ نجد کے ذروں نے لو دیدی | چھلک اٹھا یہ کس کا حسن عالم سوز محمل سے
ٹھہر جا تیری محویت کی اک تصویر تو لے لوں | ارے خلوت میں باتیں کرنیوالے مضطرب دل سے

(۳)

نہ ہوئی ہم سے شب بسر نہ ہوئی | کس سے پوچھیں کہ کیوں سحر نہ ہوئی
وہ نظر شوخ و فتنہ زا ہی سہی | کیوں مرے حال زار پر نہ ہوئی
بزم میں یہ ادا ہمیں سمجھے | سب کو دیکھا ادھر نظر نہ ہوئی
اے مرے حال پوچھنے والے | تجھکو اب تک مری خبر نہ ہوئی
ہم ابھی زندگی پہ مرتے ہیں | جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی
کیسے کیسے ستم ہوئے تجھ پر | کیوں مرے دل تجھے خبر نہ ہوئی
روح عالم میں پھونکدی تو کیا | مری جانب تو اک نظر نہ ہوئی
اف مرے غمکدے کی تاریکی | آپ آئے بھی تو سحر نہ ہوئی
دل نے دنیا نئی بسا ڈالی | اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
مجھ سے رخصت ہوئی تھی جب دنیا | تم کہاں تھے تمہیں خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے | کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

خوش رہیں وہ یہ مدعا تھا عزیز
ختم ہوئی زندگی بسر نہ ہوئی

اصغر حسین اصغر گونڈوی

وطن گورکھپور ہے۔ مگر گونڈہ کی مستقل اور طویل سکونت نے آپ کو گونڈوی مشہور کر دیا۔ ابتدائی تعلیم معمولی تھی مگر مطالعہ شوق اور خداداد ذہانت کی بدولت عربی فارسی انگریزی میں تبحر پیدا کر لیا۔ ان کی طبیعت نہایت نفاست پسند قانع اور پرسکون واقع ہوئی تھی۔ ان کا انتقال ۱۹۳۶ء میں بمقام الہ آباد ہوا اور دائرہ شاہ محب اللہ میں مدفون ہوئے۔ ہندوستانی اکیڈمی کے رسالہ تماہی کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ نے بہت شہرت حاصل کی۔

اصغر صاحب شعر بہت کم کہتے تھے اور جو کہتے تھے وہ منتخب ان کے تمام اشعار ایک ہی رنگ اور ایک ہی سانچہ میں ڈھلے ہوئے ہیں ایسی یکرنگی اور ہمواری کی مثال دوسرے شعرا کے یہاں شاید ہی ہو۔ ان کے کلام میں تصوف کا گہرا رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے حسن کلام اور ندرت بیان سے اپنی شاعری میں دلکشی پیدا کی اور عامۃ الناس کو چھوڑ کر اہل علم طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ان کے یہاں تصوف کی پاکیزہ شاعری میں حسن و عشق کے باہمی تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے ہر شعر میں لطافت اور متانت موجود ہے۔ اکثر تشبیہات اور استعارات لطیف اور نادر ہیں۔ ان میں وہ کیف و اثر اور سوز پایا جاتا ہے جو بہترین شاعری کے لئے لازمی خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔

(۱)

ترکِ مدعا کر دے عینِ مدعا ہو جا
شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا
اس کی راہ میں مٹ کر بے نیازِ خلقت بن
حُسن پر فدا ہو کر حُسن کی ادا ہو جا
برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جما کیا
اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا
آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا
قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو
اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

(۲)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اُس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

(۳)

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے
یہ سب نا آشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے

علی سکندر جگر مراد آبادی

رندی و سرمستی، جوش شراب و شباب، ذکر مے و مینا، رنگینی و رعنائی خیال جگر مراد آبادی کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ اگر شاعر کے کلام میں ابدیت کے عناصر صرف ایسی صورت میں موجود ہو سکتے ہیں کہ اس کا شعر اس کی زندگی کی تصویر ہو تو غالباً ایسے عناصر عصر حاضر میں سب سے زیادہ جگر کے کلام میں ہی ملتے ہیں۔

نام علی سکندر اور جگر تخلص ہے۔ وطن مراد آباد۔ مغلوں کے عروج کے زمانہ میں شاہجہاں آباد میں مقیم تھے۔ چنانچہ اجداد میں مولوی محمد سمیع صاحب شاہجہاں کے استادوں میں تھے۔ اسی زمانہ میں نامساعد حالات کی بناء پر ترک وطن کر کے مراد آباد چلے آئے اور اس وقت سے خاندان یہیں آباد ہے۔ شعر و شاعری اپنے والد مولوی علی نظر صاحب سے ورثہ میں پائی جو خواجہ وزیر وزیر کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے جگر کو باقاعدہ تعلیم و تربیت کا موقع نہیں ملا۔ لیکن فارسی کے مختصر

کلام اور اُردو میں فارسی تراکیب کی بیساختگی اور برجستگی سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں مطالعہ اچھا ہوگا۔ لیکن عربی سے بالکل ناواقف ہیں۔ خط نہایت پاکیزہ اور دلآویز ہے۔

جگر کے اساتذہ میں اپنے والد کے علاوہ داغ اور امیراللہ تسلیم کے نام ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ عصر حاضر کے سرآمد غزل گو شعرا میں سے حسرت اور جگر دو تسلیم کے سلسلہ میں ہیں۔ شوخی جگر نے داغ سے لی ہے اور زبان وبیان میں لکھنؤ کے اثرات قبول کئے ہیں۔ سیماب صاحب اکبرآبادی انھیں اپنا شاگرد بتاتے ہیں لیکن جگر صاحب اور اُن کے مداح اس سے انحراف کرتے ہیں۔ یہ ضرور مسلم ہے کہ جگر کے یہاں پرانے لوگوں میں سے سوائے داغ کے اور کسی کا رنگ نمایاں نہیں ہوتا۔

اُن کے کلام میں خاص موضوع آتش کرسال ہے جس کی کیفیات کو وہ خوب محسوس اور طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔ عشق و عاشقی کے بیان میں مجازہ کا رنگ ان پر غالب ہے اور اسی لئے اثرآفرینی زیادہ ہے۔ زبان سادہ اور رواں استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو ان کے بعض الفاظ اور تراکیب پر اعتراض ہے۔ لیکن جگر اپنے آپ کو ادائے مطلب میں ان سبھی بندشوں کا پابند کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اب ان پر کچھ افسردگی سی طاری ہوتی جارہی ہے لیکن سوز وگداز اسی مناسبت سے بڑھتا جارہا ہے۔ مجموعی حیثیت سے موجودہ غزل گو شعرا میں اُن کا درجہ مسلم ہوچکا ہے۔

(ا)

عشق کی یہ نمود مبہم کیا؟ — ہو نہیں تم اگر تو پھر ہم کیا؟
آہ بیتاب و اشک پیہم کیا؟ — نقد غم ہے تو حاصل غم کیا؟
جز ترے کچھ نظر نہیں آتا — آرزو بن گئی مجسم کیا؟
تیرا ملنا ترا نہیں ملنا — اور جنت ہے کیا جہنم کیا؟
میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی — عالم و ماوراے عالم کیا؟
ہم ہیں تیرے ودیعتیں تیری — شکر راحت شکایت غم کیا؟
ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں — ورنہ یہ اضطراب پیہم کیا؟
کر لیا دل نے عیش وصل قبول — پا گیا کچھ شباہت غم کیا؟
نیت شب بخیر اے ساقی — بزم جم کیا ہے۔ ساغر جم کیا؟
شوق گستاخ کر چکا تقصیر — دیکھنا اب ہے حسن برہم کیا؟
موت کی نیند چھائی جاتی ہے — کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا؟
ہمہ تن عشق برملا بن جا — درد کی اک صدائے مبہم کیا؟
اس نظر میں نہیں سماتا کچھ — جان بیتاب و چشم پرنم کیا؟

عشق خاموش کے مزے ہیں جگر
جوش فریاد و شور ماتم کیا

(۲)

کبھی شاخ وسبزہ وبرگ پر کبھی غنچہ وگل وخار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

مجھے دبنے غیظ میں دہمکیاں گریں لاکھ با یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر

جنھیں کہئے عشق کی وسعتیں جو ہیں خاص حسن کی عظمتیں
یہ اسی کے قلب سے پوچھئے جسے فخر ہو غم یار پر

مرے اشک خوں کی بہار ہے کہ مرقعِ غم یار ہے
مری شاعری بھی نثار ہے مری چشم سحر نگار پر

عجب انقلاب زمانہ ہے۔ مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر بھی تھا نوکِ یار پر

یہ کمال عشق کی سازشیں، یہ جمال حسن کی نازشیں
یہ عنایتیں یہ نوازشیں، مری ایک مشتِ غبار پر

مری سمت سے اُسے اے صبا یہ پیام آخر غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

یہ فریب جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بیخبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر

میں رہین داد سہی مگر، مجھے اور چاہئے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غمِ یار پر

(۳)

محبت کی محبت تک ہی جو دنیا سمجھتے ہیں
خدا جانے وہ کیا سمجھے ہوئے ہیں کیا سمجھتے ہیں

جمالِ رنگ و بو تک حسن کی دنیا سمجھتے ہیں
جو صرف اتنا سمجھتے ہیں وہ آخر کیا سمجھتے ہیں

کمالِ تشنگی ہی سے بجھا لیتے ہیں پیاس اپنی
ہمی تپتے ہوئے صحرا کو ہم دریا سمجھتے ہیں

سمجھنے دے انھیں اے غیرتِ جذبِ طلب ظالم
جہاں تک جانتے ہیں خود کو وہ اپنا سمجھتے ہیں

ہم اُن کا عشق کیسا اُنکے غم کے بھی نہیں قابل
یہ اُن کی مہربانی ہے کہ وہ ایسا سمجھتے ہیں

یہ کیا طاقت کہ ہم پر ڈال دے بڑھکر نظر کوئی
مگر اس جانِ محبوبی کو مستثنیٰ سمجھتے ہیں

ہمیں ہیں عشق کے مارے ہمیں پر ہے نظر اُنکی
ہمیں اپنا بنایا ہے ہمیں اپنا سمجھتے ہیں

محبت میں نہیں سیرِ مناظر کی ہمیں پروا
ہم اپنے ہر نفس کو اک نئی دنیا سمجھتے ہیں

نگاہِ شوق ہی کچھ جانتی ہے رازِ مستوری
وہ خود جلوہ ہے اُن کا سب جسے اپنا سمجھتے ہیں

خبر اس کی نہیں اُن خام کارانِ محبت کو
ہمی کو دکھ بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

فضائے نجد ہو یا قیسِ عامر اے جگرؔ ہم تو
یہ جو کچھ ہے اُسے عکسِ رخِ لیلا سمجھتے ہیں

مثنویات

ایسی نظم کو مثنوی کہتے ہیں جس میں کوئی مسلسل واقعہ بیان کیا جائے مثنوی موضوع کے اعتبار سے عشقیہ، اخلاقی، تاریخی، فلسفیانہ ہر قسم کی ہو سکتی ہے اس میں آسانی یہ ہے کہ ہر شعر کا ردیف قافیہ علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اشعار کی تعداد معین و مقرر نہیں ہے۔ اسی لئے اصناف سخن میں یہ بہت مرغوب اور اہم ہے۔ اس میں منظر نگاری۔ جذبات نگاری اور زبان کی صفائی پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ یہ خوبیاں سب سے زیادہ میر حسن کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے علاوہ میر، سودا، نسیم، قلق، مومن، داغ وغیرہ نے بھی مثنویاں لکھیں لیکن سوائے نسیم کی مثنوی کے کسی اور کو قبول عام نصیب نہیں ہوا۔ البتہ نواب مرزا شوق نے جو مثنویاں لکھی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ ان میں زہر عشق سب سے زیادہ مشہور ہے۔

میر حسن دہلوی

اپنے خاندان کے متعلق اپنے والد اور خود اپنے حالات کے سلسلہ میں تذکرہ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں۔

"میری اصل ہرات سے ہے، شجرہ نسب یہ ہے...... میر امامی نوراللہ مرقدہٗ ہفت قلم اور فاضل تبحر تھے بہ سبب فضیلت شاہجہاں آباد میں تشریف لاکر اپنے زمانہ کے لوگوں میں بڑا مرتبہ پایا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اس عاجز کا تعلق شاعری سے خاندانی ہے کوئی آج کی بات نہیں بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف میلان تھا اللہ تعالیٰ نے ظرف کے موافق اس فن میں استعداد قبولیت عطا فرمائی، اصلاح سخن میں نے میر ضیاء سے لی ہے لیکن ان کے طرز گو میں کماحقہٗ نباہ نہ سکا اور دیگر بزرگوں مثلاً خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا اور میر تقی میر کی پیروی اختیار کی شروع جوانی میں گردش روزگار ناہنجار کے باعث کہ ہرگز کسی سے وفا نہیں کرتا ہے لکھنؤ اور فیض آباد پہنچا بارے نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کی قدر دانی سے معاش کا تھوڑا بہت سہارا

ہو گیا اور ان کے خلف ارجمند مرزا نوازش علی خاں بہادر کی صحبت اختیار کی، چنانچہ اب تک کسی نہ کسی طرح گزر کرتا ہوں، اکثر نواب معلّیٰ القاب کی فرمائش سے مرثیہ امام علیہ السلام بھی کہتا ہوں ان کی طبیعت مختلف فنون میں بہت رسا ہے۔ خصوصاً علم موسیقی میں تو ایسی مہارت ہے کہ بیان سے باہر ہے، مرثیہ اور سوز کہتے ہیں کہ یہ سامانِ آخرت کے لئے ہے، اور اس کا اجر اللہ کی طرف سے ہے اور سالار جنگ بہادر بھی اسی طرح ذہن رسا اور گوش شنوار کھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مع دولت و امارت اور فرزند کے جب تک دنیا قائم ہے زندہ اور سلامت رکھے" فقیر نے اس مدت میں قریب سات آٹھ ہزار شعر کہے، ایک ترکیب بند اور ایک مثنوی موز العارفین لکھی ہے جسے لوگوں نے بہت پسند کیا ہے اور وہ مشہور ہے۔"

مثنویات میں سحر البیان جو عام طور پر مشہور ہے میر حسن کی مثنویوں میں سب سے بہتر ہے۔ کیا باعتبار زبان اور کیا باعتبار جذبات اردو کی کوئی دوسری مثنوی اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچی، بعد میں علاوہ اور لوگوں کے نواب مرزا شوق لکھنوی نے اس رنگ میں مثنوی لکھنے کی کوشش کی لیکن میر حسن کے برابر نہ ہو سکے، مثنوی سحر البیان تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہے کیونکہ اُردو کی پہلی مثنوی قطب مشتری سنہ ۱۰۱۸ھ سے لیکر میر حسن تک متعدد عشقیہ مثنویاں نظم ہوئیں لیکن تخیل اور محاکات کا ایسا صحیح توازن جیسا سحر البیان میں ہے کسی دوسری مثنوی میں نظر نہیں آتا، اس کی خوبیوں کو نہایت مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"جامعیت، اصلیت اور مناسبت" یہ تین خوبیاں ایسی ہیں جو اُردو کی ایک مثنوی میں نظر نہیں آتیں۔" فطرتِ انسانی سے واقفیت ہر جگہ ظاہر ہے اور قلبی واردات کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے زائد گزر جانے پر بھی مثنوی آج ایسی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ جس طرح غالباً میر حسنؔ کے اپنے زمانہ میں دیکھی جاتی ہو گی اس مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک لکھنؤ کی شاعری کا اپنا مخصوص رنگ شباب پر نہیں آنا تھا اور دہلی سے آنے والے شعرا اپنی رفتار و گفتار پر ناز کرتے تھے، میر حسن کا انداز طبیعت دہلوی ہے۔ وہ جذبات نگاری اور آفرینی پر کوشش صرف کرتے ہیں اور زبان میں دہلی والوں کی آتیاں جاتیاں قائم رکھتے ہیں۔ یہی صفات ہیں جو انہیں کے اپنے دادا سے ورثہ میں ملتی ہیں اور غالباً اسی کا تصرف ہے کہ لکھنؤ کے عام مذاق کے خلاف وہ جذبات نگاری اور داخلی شاعری کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

مثنوی میں مختلف لوگوں کا ذکر آیا ہے، ان میں عمر اور مرتبہ کے لحاظ سے فرق ہے، میر حسنؔ کی بلاغت کا یہ کمال ہے کہ جیسا موقع دیکھا ہے ویسے جذبات نظم کئے ہیں۔ فراق کے موضوع میں ہی ایسے کئی موقعے نکلے ہیں ماں باپ کا حال بیٹے کی جدائی میں، بے نظیر کا حال بدرِ منیر کی جدائی میں، بدرِ منیر کا حال بے نظیر کی جدائی میں، محل کی خواصوں کی کیفیت شاہزادے کے غائب ہو جانے کے بعد اور اسی قسم کی بہت مثالیں ہیں، ہر موقع پر اصلیت اور مناسبت کا لحاظ رکھا ہے۔

حمد

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم
جھکا جس کے سجدے کو اوّل قلم

سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں
کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا
ہوا حرف زن یوں کہ ربّ العلا

نہیں تیرا کوئی نہ ہوگا شریک
تری ذات ہے وحدہٗ لاشریک

پرستش کے قابل ہی تو ہے کریم!
کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

رہِ حمد میں تیری عزّ و جل
تجھے سجدہ کرتا چلوں سر کے بل

وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے
قلم جو لکھے اُس سے افزود ہے

سبھوں کا وہی دین و ایمان ہے
یہ ہیں دل تمام اور وہی جان ہے

ترو تازہ ہے اُس سے گلزارِ خلق
وہ ابرِ کرم ہے ہوا دارِ خلق

اگرچہ وہ بے فکر و غیور ہے
ولے پرورش سب کی منظور ہے

کسی سے نہ برآوے کچھ کام جان
جو وہ مہرباں ہے تو کل مہرباں

اگرچہ یہاں کیا ہے اور کیا نہیں
پر اس بن تو کوئی کسی کا نہیں

ہوئے پر نہیں اُس سے رفت و گذشت
اسی کی طرف سب کی ہے بازگشت

رہا کون اور کس کی بابت رہی
ہوئے اور جیتے وہی ہے وہی

نہاں سب میں اور سب سے ہے آشکار
یہ سب اُس کے عالم ہیں ہژدہ ہزار

وہی سب میں اُس سے وہی سب سے بیش　　ہمیشہ سے ہے اور رہے گا ہمیش
چمن میں ہیں وحدت کے یکتا وہ گل　　کہ مشتاق ہیں جس کے یاں جزو کل
اُسی سے ہے کعبہ اُسی سے کنشت　　اُسی کا ہے دوزخ اُسی کا بہشت
جسے چاہے جنت میں دیوے مقام　　جسے چاہے دوزخ میں رکھے مدام
وہ ہے مالکِ ملک دنیا و دیں　　ہے قبضہ میں اُس کے زمان و زمیں
سدا بے نمودوں کی اس سے نمود　　دل بستگاں کا ہی اُس سے کشود
اُسی کی نظر سے ہی ہم سب کی دید　　اُسی کے سخن پر ہے گفت و شنید
وہی نور ہی سب طرف جلوہ گر　　اُسی کے یہ ذرے ہیں شمس و قمر
نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے　　وہ کچھ شے نہیں پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں وہ ہی نہ ہے سنگ میں　　وہ لیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں
وہ ظاہر ہیں ہر چند ظاہر نہیں　　پہ ظاہر کوئی اُس سے باہر نہیں
تامل سے کیجے اگر غور کچھ　　تو سب کچھ وہی ہی نہیں اور کچھ
اُسی گل کی ہی بو سے خوشبو گلاب　　بھرے ہے لئے ساتھ دریا حباب
پر اُس جوش میں آکے بہتا نہیں　　سمجھنے کی ہے بات کہتا نہیں
قلم گو زبان لاوے اپنی ہزار　　لکھے کس طرح حمد پروردگار
کہ عاجز ہے یاں انبیا کی زباں　　زبانِ قلم کو یہ قدرت کہاں
اس اظہار سے کوئی بھی نکلا نہیں　　سوا عجز درپیش یاں کچھ نہیں
وہ معبود یکتا خدائے جہاں　　کہ جس نے کیا کن میں کون و مکاں
دیا فضل داد اک اُس نے ہمیں　　کیا خاک سے پاک اُس نے ہمیں

پیمبر کو بھیجا ہمارے لئے
وصی اور امام اُس نے پیدا کئے
جہاں کو انھوں نے دیا انتظام
برائی بھلائی سوجھائی تمام
دکھائی انھوں نے ہمیں راہ راست
کہ تا ہو نہ اُس راہ کی بازخواست

سو وہ کون سی راہ شرع نبی
کہ رستے کو جنت کے سیدھی گئی

خانۂ باغ

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے پڑے زرنگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا
کوئی در پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر
کہ مہ کا بندھا جس سے تارِ نظر
چھتوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گزرنا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں
وہ دیوار اور در کی گل کاریاں
دیے ہر طرف آئینے جو لگا
گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش ایسا ستھرا کہ بس
بڑھے جس سے آگے نہ پائے ہوس
رہیں تخلخلے اُس میں روشن مدام
معطر شب و روز جس سے مشام

چھپر کھٹ مرصع وہ دالان میں ، چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں
زمیں پر تھی اس طور اس کی جھلک ، ستاروں کی جیسے فلک پر چمک
زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں ، کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر ، گئی چار سو اس کے پانی کی لہر
کھڑے تھے قرینے سے سرو سہی ، خدا دور دور اُن سے سیب و بہی
کہوں کیا میں کیفیت داربست ، لگائے رہیں تاک داں مے پرست
ہوئے ہیں بہاری سے کچھ لہلہے ، چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے
زمرد کی مانند سبزہ کا رنگ ، روش پر جواہر لگا جیسے زنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار ، گل اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے ہرا باغ گل سے چمن ، کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا ، کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں ، مدن بان کی اور ہی آن بان
کہیں جعفری اور گیندا کہیں ، سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار ، کہ ہر اک سفیدی سے مہتاب وار
کھڑے سرو کی طرح جھلیا کے جھاڑ ، کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن ، عجب رنگ کے زعفرانی چمن
پڑا آب جو ہر طرف کو بہے ، کہیں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا ، اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر ، نشے کا سا عالم گلستان پر

لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں | چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے
کہیں تخم پاشی کریں گود کر | پنیری جمادیں کہیں کھود کر
کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال | رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال
خراماں صبا صحن میں چار سو | دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے | لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور | درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا | ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول | پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں | لگی جائیں آنکھیں لئے جن کا ناؤں

درختوں نے برگوں کے کھولے ورق
کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق

پنڈت دیا شنکر نسیم

آتش کے شاگردوں میں شہرت کے اعتبار سے نسیم کا پایہ سب سے بلند ہے، نام دیا شنکر کول تھا، کشمیری الاصل پنڈت تھے، چنانچہ مثنوی گلزار نسیم کی تمہید میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

خوبی سے کرکے دلوں کو تسخیر   نیرنگ نسیم باغ کشمیر

والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا جو کشمیری پنڈتوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیری پنڈتوں کے نام اردو اور فارسی ادب میں عام طور پر متعارف ہیں۔ اردو فارسی تعلیم ان خاندانوں میں عام طور پر رائج تھی ایسے ماحول میں ۱۲۲۷ھ ۱۸۱۲ء میں نسیم پیدا ہوئے اردو فارسی کی تعلیم بقدر ضرورت حاصل کی امجد علی شاہ کا زمانہ تھا، شاہی فوج میں بخشی گری کے عہدے پر مامور ہوئے لیکن عین عالم شباب میں ۳۲ سال کی عمر پاکر ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء میں رحلت کر گئے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ مثنوی گلزار نسیم ہے۔ اگرچہ فن کے اعتبار سے اردو کی بہترین مثنوی سحر البیان ہے لیکن صناعی اور لطف بیان کے اعتبار سے مثنوی گلزار نسیم بھی سحر البیان سے بہتر ہے، یہ خالص لکھنوی رنگ کی پیداوار ہے بلکہ اس دبستان شاعری کا معیاری نمونہ اسی مثنوی کو قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا اس میں جذبات نگاری کی طرف کم توجہ صرف کی گئی ہے۔ لیکن اس کی تلافی الفاظ کے انتخاب، تشبیہات، استعارات کی ندرت و برجستگی اور بندش کی چستی سے کر دی گئی ہے۔ اصلاح زبان کا جو کام ناسخ، آتش اور ان کے تلامذہ نے شروع کیا تھا اس سے نسیم نے پورا فائدہ اٹھایا اس حیثیت سے لکھنوی شاعری میں نسیم کی یہ مثنوی بڑا درجہ رکھتی ہے۔

تاج الملوک کا باغ بکاولی میں پہنچنا

وہ دامن دشتِ شوق کا خار   یعنی تاج الملوک دل زار
اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد   صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سائے کو پتا نہ تھا شجر کا   عنقا تھا نام جانور کا
وہ دشت کہ جس میں پرتگ و دو   یا ریگِ رواں تھی یا وہ رہرو
ڈانڈا تھا ارم کے بادشا کا   اک دیو تھا پاسباں بلا کا
دانت اس کے تھے گورکن قضا کے   دو نتھنے رہ عدم کے ناکے
بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک   فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک
شہزادہ کہ منہ میں تھا اجل کے   اندیشہ سے رہ گیا دہل کے
پل مارنے کی ہوئی جو دیری   سبحان اللہ شان تیری
اُشتر کئی جاتے تھے اُدھر سے   پُر آرد و روغن و شکر سے
وہ دیو لپک کے مار لایا   غراتے ہوئے شکار لایا
اونٹوں کی جو لوتھیں دیو لایا   دم اُس کا نہ اُس گھڑی سمایا
وہ اونٹ تھے کاروانیوں کے   سب ٹھاٹھ تھے میہمانیوں کے
میدا بھی، شکر بھی، گھی بھی پایا   خاطر میں یہ اُس بشر کے آیا
میٹھا اس دیو کو کھلاؤ   گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

حلوے کی پکا کے اک کڑھائی — شیرینی دیو کو چڑھائی
ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا — حلوے سے کیا منہ اُس کا میٹھا
کہنے لگا کیا مزا ہے دل خواہ — اے آدمی زاد واہ وا واہ
چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو — کیا اس کی عوض میں دوں میں تجھ کو
بولا وہ کہ پہلے قول دیجے — پھر جو میں کہوں قبول کیجے
وہ ہاتھ پہ اُس کے مار کر ہاتھ — بولا کہ ہے قول جان کے ساتھ
بولا وہ کہ قول اگر یہی ہے — بد عہدی کی پر نہیں سہی ہے
گلزار ارم کی ہے مجھے دھن — بولا کہ ارے بشر وہ گلبن
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے — اندیشے کا واں گزر نہیں ہے
واں موج ہوا ہوا پہ اژدر — واں ریگ زمیں زمیں پہ اخگر
رہ جا مرا بھائی ایک ہے اور — شاید کچھ اس سے بن پڑے طور
ایک ٹیکرے پر گیا بلایا — وہ مثل صدائے کوہ آیا
حال اُس سے کہا کہ قول ہارا — ہے پیر یہ نوجواں ہمارا
مشتاق ارم کی سیر کا ہے — کوشش کرو کام خیر کا ہے
حمالہ نام دیونی ایک — چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک
خط اُس کو لکھا بایں عبارت — اے خواہر مہرباں سلامت
پیارا یہ مرا ہے آدمی زاد — رکھیو اسے جس طرح مری یاد
انساں ہے یہ چاہیے کچھ سازش — مہماں ہے کیجیو نوازش
خط لے کے بشر کو لے اڑا دیو — پہنچا حمالہ پاس بے ریو

بھائی کا جو خط بہن نے پایا ۔ بھیجے ہوئے کو گلے لگایا
وہ بولی جو تو کہے زباں سے ۔ تارے تو اُتاروں آسماں سے
چہرے کو چھپا کے زیرِ چادر ۔ اُس نے یہ کہا کہ میری مادر
ہے باپ جو اندھے پن سے جھول ۔ مطلوب بکاولی کا ہے پھول
دل داغ مرا برائے گُل ہے ۔ نرگس کے لئے ہوائے گُل ہے
ساعی تھی بدل یہ کہنے والی ۔ رہ اُس نے سرنگ کی نکالی
جب مہر تہِ زمیں سمایا ۔ اُس نقب کی رہ وہ آدم آیا
صحن چمن ارم میں اک جا ۔ چوٹا سا نہ زمیں سے نکلا
کھٹکا جو نگاہ بانوں کا تھا ۔ دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا
گوشے میں کوئی لگا نہ ہووے ۔ گوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے
گو باغ کے پاسباں غضب تھے ۔ خوابیدہ برنگِ سبزہ سب تھے
نرگس کی کھلی نہ آنکھ یک چند ۔ سوسن کی زباں خدا نے کی بند
خوش قد وہ چلا گُل و سمن میں ۔ شمشاد رواں ہوا چمن میں
ایوانِ بکاولی جدھر تھا ۔ حوض آئینہ دار بام و در تھا
پانی کے جو بلبلوں میں تھا گُل ۔ پہنچا لبِ حوض سے نہ تا گُل
پوشاک اُتار، اتر کے لایا ۔ پھولا نہ وہ جامے میں سمایا

گُل لے کے بڑھا ایاغ بر کف
چوری سے چلا چراغ بر کف

گلچیں کی تلاش

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا | اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام | یعنی وہ بکاولی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے | اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی | پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے | کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل | جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون | ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے | بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل | سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا! | شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
گھبرائیں خواصیں صورتِ بید | ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں | سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا | کہنے لگیں کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون | بیگانہ نہ تھا سبزہ کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا | اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے | جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاولی کہ افسوس | غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا | پتلی وہی چشمِ حوض کا تھا

نام اُس کا صبا، نہ لیتی تھی میں   اُس گل کو ہوا، نہ دیتی تھی میں
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا   غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل   مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا   خوشبو ہی سنگھا، پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک، اگر خبر ہے   گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام   تھی سبزے سے راست مو براندام
انگلی لبِ جو پہ رکھ کے شمشاد   تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا   جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اُس کا غرض لگا بدلنے   گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی   دست آویز اُس کے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی   انسان کی دست بُرد جانی
ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات   خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا   وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے   کھال اُس کی جو کھنچے سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک   خوں رو لی لباس کو کیا چاک
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ   آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں بھولتی پھری وہ   ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی   اُس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے؟   پتّا کہیں حکم بن ہلا ہے؟

نواب مرزا شوق

حکیم تصدق حسین خاں نام شوقؔ تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی فضا اور ماحول سے متاثر بھی تھے۔

شوقؔ کی شہرت اُن کی مثنویوں کی بدولت ہے۔ ابتدا میں غزلیں لکھا کرتے تھے لیکن شہرت نہ حاصل کر سکے۔ ان کی زبان میں بلا کی فصاحت تھی۔ اور جب اسی فصیح زبان میں مثنوی کی طرف متوجہ ہوئے تو جذبات کا دریا امنڈ آیا اور مثنوی زہرِ عشق ایسی لکھی جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ سلاست شگفتگی اور روانی آپ کی مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ آپ کے فصیح و بلیغ اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ اکثر حضرات کے نزدیک ان کی مثنویوں کی اخلاقی حیثیت مسلم نہیں۔

سرائے فانی

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　موردِ مرگِ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے　　آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم　　آج اُس جا ہے آشیانہ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو　　صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی　　نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے　　ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم　　ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم
کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام　　کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے　　اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج　　آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خود سر جہاں میں مشہور　　خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے　　نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے　　استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور　　باقی اُن کا نہیں نشانِ قبور

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر

رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسین
کھا گئے اُن کو آسمان و زمین

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دُنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا

بوئے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

صبح کو طائرانِ خوش الحال
پڑھتے ہیں "کل من علیہا فان"

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

زندگی بے ثبات ہے اس میں
موت عین حیات ہے اس میں

شاد عظیم آبادی

سید علی محمد نام شاد تخلص ۱۸۴۷ء میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے رواج اور حیثیت کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ لڑکپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی اور مختلف استادوں سے عرصہ تک اصلاح لیا کئے آخر میں سید شاہ الفت حسین فریاد کے مستقل شاگرد ہو گئے۔ فریاد اپنے وقت کے استاد تھے لیکن آج جو شہرت شاد کے نام کو حاصل ہے فریاد کے نام کو نہیں پھر بھی شاد کے جملہ اساتذہ کا نام محض ایک شاد کی بدولت زندہ ہے۔ حالی آزاد اور مولوی اسمٰعیل شاد کے ہم عصر تھے۔ ایک دیوان اور کئی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

یوں تو جملہ اصنافِ سخن پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی میں بھی شہرت حاصل کی مگر مرثیہ اور غزل آپ کا خاص حصہ ہے۔ آپ نے میر مونس اور میر انیس کی زبان کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

شاد کو عام فہم الفاظ اور روزمرہ کے استعمال پر مہارت حاصل ہے۔ اس واسطے اور بھی کہ وہ بہت سے اساتذہ سے اکتساب فیض کر چکے تھے۔ وہ شاعری میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں بیک وقت یاس انگیزی۔ بلند نظری اور تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

مادرِ ہند کی روز افزوں ترقی

ہے اب جو بہار کا زمانہ — یوں ہے لب خامہ پر ترانہ
بدلا ہے جو رنگ آسماں نے — پہنی ہے نئی قبا جہاں نے
پھولوں نے کہن لباس اُتارا — باغوں کو بہار نے سنوارا
لائی جو نسیم صبح گہنا — اترا کے عروس گل نے پہنا
سبزہ کا پلٹ گیا زمانہ — بیگانہ تھا اب ہوا یگانہ
ہر چند تھی فصل گل بہت دور — آرائش باغ تھی جو منظور
دیکھا جو ذرا صبا نے مڑ کر — گل آرہے پھر چمن میں اُڑ کر
پھوٹی جو نئے سرے سے کونپل — ہر نخل میں قدرتی لگے پھل
سنبل نے جو گیسوؤں کو دی تاب — چہرہ ہوا یاسمن کا شاداب
کیوں کہئے ہے چشم نرگس احول — آنکھوں میں دیا صبا نے کاجل
پایا زر گل تو بن گیا بن — دریا نے بھرا گہر سے دامن
سمجھے تھے زمیں کی جیب خالی — اس نے بھی تو اشرفی نکالی
کیا سرخ ہے لالۂ شفق گوں — ڈرتا ہوں بہے نہ پھوٹ کر خوں
دی گل کو عجب خبر صبا نے — زر لے کے چلا کھلے خزانے
افزوں ہے بہار کا جو منصب — صد برگ ہزار برگ ہے اب

کرتا ہے فلک جو زر فشانی سونا نظر آرہا ہے پانی
جب خاک طلا کا رنگ پکڑے ہر ذرہ خوشی سے کیوں نہ اکڑے
ہو تیس برس سے عیش و عشرت پائی ہے جہاں نے جو راحت
رنگت نکل آئی پیاری پیاری حافظ رہے اب جناب باری
ہے قیصر ہند کا ثنا خواں کیوں ہو نہ قلم کے ہاتھ میداں
کرتا ہوں جو باگ سے اشارے بھرتا ہے یہ تیز دو طرارے
ہے وہم و خیال سے بھی چالاک ایسا نہ ہو پھاند جائے افلاک
ہے اب جو بہار پر زمانہ زر فام قلم کا ہے دہانہ
در پیش ہے راہ ذی کمالی کیوں نعل نہ اس کے ہوں ہلالی
جو سطر ہے شاخ نارون ہے کاغذ نہیں دامن چمن ہے
آئی ہے وہ کلک میں روانی دیکھے سے ہو جس کے ابر پانی
دریائے کرم نکل رہا ہے اک چشمۂ فیض ابل رہا ہے
مٹھی میں چھپا لیا ہے صحرا کوزے میں کیا ہے بند دریا
جو لفظ ہے اس میں اک حوالا جس شعر کو دیکھئے رسالہ
ہر نقطہ میں مطلب اک نہاں ہے ہر نکتہ میں پوری داستاں ہے
ہر حرف کی آب و تاب برتر کیسے ہیں بھرے ہوئے ہیں گوہر
جو بات ہے معجز مسیحا مردے نہ ہوں کس طرح سے زندا
اُمڈے جو ترقیوں کے بادل پھوٹی ہے نئی قلم میں کونپل
قرطاس بھی ہو چلا ہے کاہی شنجرف بنے گی اب سیاہی

جو پھول ہے باغ باغ ہے اب — جو ذرہ ہے اک چراغ ہے اب
زردی کہیں نام کو نہیں ہے — ہر گوشک و در زمردیں ہے
ہر سنگ خذف ہے رشک بلور — ہر کوہ بلند غیرتِ طور
ہر چوب ہے تختۂ نگاریں — ہر قطعہ نگارخانۂ چیں
مٹی کو طلا پہ اب شرف ہے — جو خشت ہے رو کش صدف ہے
بدلا ہے زمیں کا اب وطیرا — آہن بھی تو اب بن گیا ہے ہیرا
کیا فیض نقمنتھی ہے ہر سو — جس جس پہ نظر کرو وہ جادو
کاغذ کا لگا ہوا جو پر ہے — اک طائرِ تیز پر، خبر ہے
دے ساتھ اگر ہوا خبر کا — مٹی ہو ریاض عمر بھر کا
اسٹیم نے پائی ایسی وہ طاقت — روکے اسے کیا فلک کی قدرت
خود جہل و نفاق ہیں پشیماں — ہے صلح ہر ایک در کی دربان
سب شاد ہیں متقی ہوں یا رند — جیبوں میں بھری ہے دولت مند

ہر لب پہ خوشی کا ہے ترانہ
یوں تیس برس کٹا زمانہ

قصیدہ

قصیدہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف کی جائے۔ اس کے کئی حصے ہوتے ہیں، پہلا حصہ تمہید یا تشبیب کہلاتا ہے جس میں ذکر بہار یا ذکر شراب ہوتا ہے لیکن اس موضوع کی پابندی ضروری نہیں ہے تشبیب میں غزل، اخلاقی مضامین، مکالمہ وغیرہ بھی بیان کئے جا سکتے ہیں تشبیب کے بعد گریز ہوتا ہے یعنی تشبیب کو مدح یا تعریف کے مضمون سے اس طرف ملاتے ہیں کہ سلسلۂ کلام قائم رہے گریز سے قصیدہ گو شاعر کے کمال کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ گریز کے بعد مدح آتی ہے جہاں ممدوح کی تعریف ہوتی ہے۔ قصیدہ دعائیہ کلمات پر ختم ہوتا ہے جہاں ممدوح کو دعا اور اس کے دشمنوں کو بددعا دی جاتی ہے۔

قصیدے کے لئے خیال کی بلندی، اور زبان کی شان و شوکت ضروری ہے۔ اس میں غزل کا رنگ اختیار کرنے سے کمزوری پیدا ہوتی ہے، اسی وجہ سے بالعموم غزل گو شعراء سے عمدہ قصیدہ کا سرانجام پانا دشوار ہے۔

اردو کے مشہور قصیدہ گو سودا، ذوق، غالب، مومن، امیر اور عزیز ہیں۔ موجودہ دور میں قصیدہ گوئی کا رواج تقریباً اٹھ چکا ہے۔

مرزا رفیع سوداؔ

سوداؔ غزل کے علاوہ قصیدہ بھی لکھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی فن کے بادشاہ ہیں۔ اردو شعرا میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی کے مسلّم اساتذہ کے مقابلہ میں قصیدے لکھے اور کامیاب ہوئے۔ قصیدہ کے لئے طبیعت میں جولانی فکر میں بلندی اور تخیل میں ندرت کا پایا جانا ضروری ہے یہ سب باتیں سوداؔ میں موجود تھیں۔ اُن کے قصائد موضوع کے اعتبار سے بہت متنوع ہیں۔ بعض قصیدے بزرگانِ دین کی تعریف میں بعض امرا و وزرا کی مدح میں لکھے ہیں بعض میں اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی تصویر کھینچی ہے مثلاً قصیدہ شہر آشوب اور قصیدہ تضحیک روزگار۔ اُن کے قصیدوں میں تشبیب خوب ہوتی ہے اس میں سوداؔ کا مقابلہ سوائے ذوقؔ کے اور کوئی نہیں کر سکا۔ قصیدے کے لئے زبان پر بڑی قدرت درکار ہے۔ الفاظ پر شکوہ تراکیب بلند آہنگ تشبیہات اور استعارات اعلیٰ درجہ کے درکار ہیں۔ سوداؔ میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ اس پر فطرت کا وسیع مطالعہ اور ماحول کا تجزیہ ان کا خاص حصہ ہے۔ قصیدہ کا دوسرا پہلو ہجو ہے۔ اس میں اُردو کا کوئی شاعر اُن کا حریف نہیں۔ اگرچہ بعض ہجویات میں وہ اعتدال سے بڑھ گئے مگر بحیثیت مجموعی ان کی ہجویات قابلِ قدر ہیں۔

مدح نواب آصف الدولہ

کیا قلم کو رقم سے ہے منظور / کہ صریر اس کے سے ہے دل مسرور
نور صبح بہار کاغذ پر / خط خطِ گلعذار کا دستور
زلف خوبانِ چین سے خوبی میں / کھینچے ہر سطر جس کے آب کو دور
ہے تبسم قلم کے منہ پر شق / قلم اپنی رقم سے ہے مسرور
خامہ پیش از گیاہ کیا ہے جسے / ہو رقم سے یہ خوش دلی کا وفور
مگر اس امر ہیچ کرتا ہے / اس طرف انتقال ذہنِ شعور
کہ لکھا چاہتا ہے اس کی مدح / خلق میں جس کے خلق ہے مشہور
یعنی نواب آصف الدولہ / ہو سلیماں پہنچ کے جس تک مور
ہے توان بخش ناتواں کا وہ / شاہد اس کا ہے متفق جمہور
لے گیا ہیل پیل کو پشہ / اس کے آگے گیا جو باہم زور
شعلہ پیدا ہو جس دم اس کی تیغ / ہووے خاکِ سیہ عدم میں فتور
اس کی برش کا وصف کیا میں کروں / سخت اور نرم پر باہیں دستور
سخت پر جیسے تار صابن میں / نرم پر جوں ہوا میں بال طیور
یاد ہیں اس کے باندھے جو کمر / رن میں پھر لے مظفر و منصور
مدح غائب سے دل ہے اپنا تنگ / ہو تنک لے خامہ باریاب حضور
وہ جو تیری کماں کی سیر ہے / کس کو اس کے اٹھانے کا مقدور
وصف شوخی میں یاد باگی تمہیں / کرتی ہے اب زبانِ برق قصور
ہے فرس کس کے زیر راں ایسا / جس کے جلوے کا ہووے یہ مذکور
کر دے پل میں تمام روئے زمیں / سینۂ باز نقش لعل ستور

اگر ایسی ہی تیرے ہاتھی کے — جس کا پروردۂ نمک ہے غرور
دیکھ اس پر تجھے یہ بولی خلق — ہے تجلی حق بکوہِ طور
فتنۂ دہر میں نسق سے ترے — کوئی ہووے ممد کیا مقدور
خس و آتش ہو جس جگہ واں سے — راہ چپ کر وہ جائے بادِ دبور
مانگ دے عدل دیدۂ شاہیں — پھر نظر دیکھے گر سوئے عصفور
گر ہو آتش پہ تجھ غضب کی نگاہ — ہو حرارت کا اس میں بھی نہ وفور
زندگی کے لئے سمندر بھی — چاہے مسکن یہ معدنِ کافور
تیری فیض نگاہ کو پر کاہ — پہنچ کر چاہیے نہ ہو مغرور
کوہ ہو جائے تجمل شیشہ کے — گر کے نظروں سے تیری چکنا چور
تو وہ دریائے فیض ہی جس سے — واہمہ کر سکے کبھو نہ عبور
تیری بخشش ہی یہ کہ گوہر سے — جوں صدف مشت خلق ہی معمور
مطلب اس نظم سے ترے آگے — کچھ خوشامد مجھے نہیں منظور
بسکہ ہے لائق ثنا یہ جناب — مدح کرنی ہوئی مجھے بھی ضرور
میری ہی اعتقاد ہے یہ مدح — ورنہ رتبہ ترا ہے اتنا دور
کہ جو چاہے خیال واں جائے — پہنچنے کا اسے کہاں مقدور
کہکشاں خامہ آسماں کاغذ — ہو مرکب اگر شب دیجور
اتنے ساماں پہ تیرے سب اوصاف — آویں تحریر میں یہ کیا مقدور
ختم سودا کرے سخن بدعا — آمیں سب بولیں بندگان حضور

فضل سے حق کے تو بہ حشمت و جاہ
رہے تا حشر خرم و مسرور

شیخ محمد ابراہیم ذوق

انھیں اپنی قصیدہ گوئی کی بدولت خاقانی ہند کا خطاب نصیب ہوا اور حقیقت ہی کہ سودا کے بعد اس پایہ کا دوسرا قصیدہ گو اُردو شاعری کی تاریخ میں مشکل سے ملتا ہے۔ ان قصائد میں ان کی علمیت کا خاص طور پر اظہار ہوتا ہے۔ مختلف علوم و فنون کی بکثرت اصطلاحیں نظم کی ہیں؛ زبان متروکات سے پاک ہے اور اس اعتبار سے یہ سودا سے بڑھ گئے ہیں لیکن ان کے قصائد میں سودا کا تنوع نہیں اور نہ ماحول کی وہ مصوری ہے تاہم ان کے قصیدوں میں اس عہد کی بہترین زبان کا ایک عمدہ نمونہ محفوظ ہے۔

مدح ابوظفر بہادر شاہ

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر — اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا — تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

رزق تو در خورِ خواہش ہی پہنچا سب کو — مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت — غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلاً گوہر

کورِ باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت — کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر

جوہرِ خوب کو درکار ہے آرائشِ خوب — خوب تو آب کی خوبی سے ہی ٹھیرا گوہر

ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد — ہو نہ ہم صحبتِ تارِ رگِ خارا گوہر

دل خراش اور ہے طاقت سے دل ہی کچھ اور — کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر

صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہو شرط نظر — کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر

صاف باطن کی ہو حیب قلبر کہ ظاہر ہو درست — یوں بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر

ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی — تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر

خلشِ خارِ جنوں سے ہے پروتا گیا کیا — ہر قدم پر قدم آبلہ فرسا گوہر

ذوق موقوف کر اندازِ غزل خوانی کو — ڈھونڈ اس بحر میں اب تو کوئی اچھا گوہر

غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر — آگے تقدیر سے خرمہرہ ملے یا گوہر

وہ بہادر شہ غازی کہ برنگِ نیساں — روز برسائے ہے ابرِ کرم اس کا گوہر

جس سے اس کے ہی اک فیض کا دریا جاری — بہتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا گوہر

پہنچے گر گوشِ صدف تک یہ نویدِ عشرت
اتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر

مدحِ حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر
آج ہے خامہ مرا منہ سے اگلتا گوہر

آج وہ دن ہے کہ اے خسرو والا گوہر
کوہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر

بحر و بر میں ہے شہا تیری مہیائے نثار
سیم سے زر تلک اور لعل سے لے تا گوہر

مشتری کہتے ہیں جس کو وہ اٹھا لایا چرخ
ٹوٹ کر جو ترے سمرن سے گرا تھا گوہر

صبح اقبال و سعادت کا ستارا چمکا
جو ترا طرۂ دستار کا چمکا گوہر

درفشانی سے تری اتنے گہر ہیں ارزاں
لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبا گوہر

کوہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبتِ عدل
گریہ سن پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر

آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب
ابر مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

سینہ صافی کا تری ایک ہے نقشہ دریا
دل روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر

خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصاف نکو
تو سدا منہ سے مرے پھول جھڑیں یا گوہر

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
تا کہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر

تار ہے پنجۂ خورشید یہ ہر روز طلا
تا گرہ میں رکھے شب عقدِ ثریا گوہر

دانۂ انجم گردوں سے پرو لے جب تک
رشتۂ کاہکشاں میں شبِ یلدا گوہر

جب تلک جوش بہاراں سے ہوائے دمِ صبح
ٹانکے شبنم سے سر دامنِ صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجھ کو مبارک ہووے
برسیں نیسانِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر روز نصیب
ہو نہ جز اشک سرِ دامنِ اعدا گوہر

غالب

غالب کو قصیدہ سے دلچسپی نہ تھی اس لئے کہ وہ دنیا سازی کے قائل نہ تھے اور قصیدہ کے لئے لازمی ہے کہ تعریفیں کرے خوشامد کی جائے یا ہجو کہہ کے دل کا بخار نکالا جائے۔ پھر بھی دو چار قصیدے جو غالب نے لکھے ہیں اس صنعت میں سنگِ میل کا کام دیتے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں آمد، شانِ شکوہ اور جذبہ پایا جاتا ہے۔ مضامین کی بلندی اور رفعتِ تخیل کی بدولت مختصر سے قصیدے دیگر شعرا کے قصیدوں کے دفتر پر فوقیت رکھتے ہیں۔

مدح ابوظفر بہادر شاہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاص خواص
حبذا اے نشاطِ عام عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرز استفہام
مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روزہ بر سبیل دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جز بہ تقریب عید ماہ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو — پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص — گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرّ فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جبکہ چودہ منازل فلکی — کر چکے قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنئ الہام

بزم میں میزبان قیصر و جم
رزم میں استادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافئ ناوک
آفریں آبدارئ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روانئ آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام

حکیم مومن خاں مومن

حکیم مومن خاں کا تذکرہ اس سے قبل غزل کے ماتحت ہو چکا ہے۔ مومن کو دنیا داری سے سخت نفرت تھی اور اسی لئے وہ ان لوگوں کی شان میں قصیدے نہیں لکھتے تھے جن سے دنیاوی فائدے کی امید ہو۔ دل کے جذبات سے مغلوب ہو کر آپ نے مذہبی پیشواؤں کی شان میں قصیدے لکھے اور قصیدوں کی ظاہری اور نمائشی خوبیوں یعنی آورد اور تصنع سے قصیدوں کو پاک رکھا احسانمندی سے متاثر ہو کر بعض کرم فرما سرپرستوں کی بھی مدح کی ہے لیکن بہت کم۔ ان کے قصیدے میں تخیل۔ بلندی مضامین اور جذبات پائے جاتے ہیں۔

مدح شاہ

یادِ ایامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں مل گئے آسماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی

کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار
کیا ہوئے وہ عماد طولانی

جائے گل ہی چمن میں ریزۂ سنگ
کاہ کرتی ہے نازِ ریحانی

سقفِ رنگین و زرنگار کہاں
جز سپہر و نجوم نورانی

ایسی وحشت سرا میں آئے کون
بے دری کر رہی ہے دربانی

شورِ زاغ و زغن ہی سمع خراش
اب کہاں بلبل و غزل خوانی

اے فلک! دل کو داغ کرتی ہے
روز خورشید کی درخشانی

جانِ مومن پہ گونہ گونہ ستم
کافر اتنی بھی نامسلمانی

اُس سے کاوش نہ کر نہ ہو ظالم
آپ اپنا تو دشمنِ جانی

تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون
کھول دوں دل میں یہ رازِ نہانی

مدح خوانِ شہ و وزیر لقب
ختم جس پر ہوئی سخن دانی

اس کے عہدِ کرم کی نسبت سے
بڑھ گئی عمرِ عالمِ فانی

گرگ نے دورِ عدل میں اس کے
سیکھ لی راہ و رسمِ چوپانی

ہے مجھے بھی خیالِ طوفِ حرم
خضرِ رہ گر ہو فضلِ رحمانی

بعد یک چند گر خدا چاہے
میں ہوں اور تیرے در کی دربانی

آ کے اس بزم میں دکھاؤں گا
شعلہ ہائے خرد کی نیرانی

میرے سینے کے صفحے میں ہے رقم
علمِ دانا دلانِ یونانی

مہرِ افلاکِ عقل و دانش ہوں
فطرتی ہے مری دُر افشانی

میرے خامہ کے جوشِ گریہ سے
روئے دیتا ہے ابرِ نیسانی

میری نسبت سے خاکِ ہند کو ہے
رونقِ سرمۂ صفاہانی

مومن! اب ختم کر دعا پہ سخن — تا کجا لا فہائے طولانی

جب تلک باعث نشاط و ملال — ہے وصال و فراق جانانی

تیرے حساد و رنج گوناگوں — تیرے احباب و رتن آسانی

تیرا اقبال روز افزوں ہو

جیسے مومن پہ لطف رحمانی

منیر

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آباد کے رہنے والے تھے لکھنؤ اور الہ آباد کے دورانِ قیام میں ناسخ کی شاگردی کی۔ ہنگامۂ غدر میں نواب باندہ کے ملازم کی حیثیت سے گرفتار کر لئے گئے اور انڈمان بھیج دیئے گئے وہاں سے واپس آئے تو رامپور مرکز بنایا اور نواب صاحب نے بڑی قدر دانی فرمائی ۱۸۸۱ء میں انتقال کیا۔ حالات سے مجبور ہو کر اور غزل کا میدان تنگ سمجھ کر منیر نے قصیدوں کی طرف توجہ کی اور بڑی شہرت حاصل کی سودا اور ذوق کے بعد قصیدہ گو کی حیثیت سے ان کا نام آتا ہے۔ ان کے قصیدوں میں وہ ساری باتیں ہیں جو قصیدہ کا جزہیں۔ لفاظی۔ مبالغہ آور وغیرہ ان کے یہاں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

مدح نواب رامپور

رُت ہے برسات کی بہت پیاری — موجزن جھیلیں ندیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر — اودی اودی سنہری زنگاری
کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے — سبز مخمل سے بھی سوا پیاری
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں پُروائی — لہریں لیتی ہیں ندیاں ساری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں — روح پر ہوتی ہے خوشی طاری
کوکلے، بگلے، کوئلیں، طاؤس — اپنی تانیں سناتے ہیں پیاری
قازیں۔ مرغابیاں۔ بطیں۔ سرخاب — جھیلوں کے ساتھ کرتے ہیں یاری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب — کر رہے ہیں نظر کی دلداری
سیر مچھلی جھبوت کی چل کر دیکھ — کیا نمایاں ہے قدرتِ باری
ہنستی پھرتی ہیں باغ میں پریاں — نہر یا جوئے شیر ہے جاری
مہندیوں سے ہتھیلیاں گلنار — ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری
کھیپے چاندی کے ریشمی جھولے — سازِ عشرت کی گرم بازاری
گا رہی ہیں ملہار کی غزلیں — اب ہے ساون ملاری باری
نقل ہر ایک ہے مطابق اصل — رنج و غم پر بھی ہے خوشی طاری
ہاتھ آتا نہیں کوئی مضمون — ذہن کرتا نہیں مددگاری

روئے خورشید ہو گیا پنہاں — شام نے کھولی زلفِ طراری
مینہ برستا ہے ہوں میں کمرے میں — شمع روشن ہے رات اندھیاری
خامہ و کاغذ و دوات و کتاب — دل میں فکر آنکھوں میں ہی بیداری
ناگہاں کھل گئی مری قسمت — بارِ غم سے ملی سبکساری
دیکھتا کیا ہوں شاہدِ معنی — محوِ ناز و ادا و طراری
شفقئی ہونٹھ چمپئی رنگت — سرمئی آنکھیں ڈورے گلناری
لغزشِ برق جلوۂ طاؤس — چال رفتار کبک کہساری
آنکھیں پتھرا گئیں تحیّر سے — دل پر اک بیخودی ہوئی طاری
اٹھ کے افتادگی نے کی تسلیم — پائے بوسی نے کفش برداری
خاکساری نے فرش کیں آنکھیں — سر نے کی پاؤں کی پرستاری
ہاتھوں نے دوڑ کر بلائیں لیں — دل نے کی بڑھ کے منت و زاری
میں نے پوچھا کہ اے مہِ بے مہر — فلکِ عالمِ جفا کاری
خاک چھنوا رہی ہے عالم میں — شعرا کو تری طلب گاری
کون سے برج میں ترا گھر ہے — کس فلک پر ہے شوق سیاری
ہنس کے اس بت نے یوں جواب دیا — لبِ شیریں سے کی شکرباری
میں ہوں ان شاعروں کی خدمت میں — جو کہ نواب کے ہیں درباری

دیکھ تو رام پور کی برسات
کیا نمایاں ہے قدرتِ باری

مرثیہ

مرثیہ کے لغوی معنی مرحوم کی تعریف کے ہیں لیکن اصطلاحاً اس صنف کو کہتے ہیں جس میں واقعاتِ کربلا کو منظوم کیا گیا ہو۔ مرثیہ کا رواج قدیم سے چلا آتا ہے۔ سوداؔ نے سب سے پہلے مرثیہ مسدس میں لکھا۔ مرثیہ کی ترقی میں یہ پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مرثیہ نے فنی حیثیت سے بڑی ترقی کی۔ مرثیہ کے مختلف مضامین سراپا وغیرہ علیحدہ علیحدہ مقرر ہوئے اور میر ضمیرؔ نے جو دبیرؔ کے استاد ہیں اس رنگ میں کمال پیدا کیا۔ اس فن میں سب سے زیادہ شہرت انیسؔ اور دبیرؔ کو حاصل ہوئی، اُن کے علاوہ خلیقؔ۔ دلگیرؔ۔ مونسؔ۔ انسؔ۔ نفیسؔ۔ پیارے صاحب رشیدؔ اور اوجؔ بھی مشہور مرثیہ نگار ہیں۔ بعد کے مرثیہ نگاروں نے جو اضافے کئے ہیں۔ اُن میں ساقی نامہ کا دخل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

مرثیہ ہی شاعری کی وہ صنف ہے جہاں اخلاق کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس لئے قدیم شاعری میں یہی صنف بہت اہم اور قابل قدر ہے۔

میر ببر علی انیس

میر ببر علی انیس تخلص ہے سنہ ۱۲۱۹ ہجری میں پیدا ہوئے مشہور اردو شاعر خلیق کے صاحبزادے اور مشہور مثنوی گو میر حسن کے پوتے تھے میر حسن اپنے والد کے ساتھ دہلی سے فیض آباد تشریف لائے تھے جہاں عرصہ تک اُن کا خاندان مقیم رہا جب نواب آصف الدولہ کے عہد میں فیض آباد کے بجائے لکھنؤ دارالخلافہ قرار پایا تو یہ بھی چلے آئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی صاحب سے پائی اور شاعری میں اپنے والد میر خلیق سے مشورہ کیا۔ گویا شاعری بھی ورثہ میں ملی، خلیق خود مصحفی کے شاگرد تھے اس طرح اُن کا سلسلہ براہ راست دہلوی شاعری سے جا ملتا ہے۔ میر انیس آخر تک اپنے دہلوی ہونے پر فخر کرتے رہے اور زبان و محاورے میں لکھنؤ کے بجائے دہلی کا اتباع کرتے تھے، جب تک سلطنت اودھ قائم رہی یہ لکھنؤ میں رہے سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد عظیم آباد بنارس، الہ آباد، اور حیدر آباد بھی مرثیے سنانے گئے سنہ ۱۲۹۱ھ میں وفات پائی۔

انیس کا مرتبہ بحیثیت شاعر بہت بلند ہے، اُن کے کلام میں الفاظ کا صحیح انتخاب، اُن کی ترتیب و تنظیم موقع اور محل کی مناسبت زبان کا استعمال، نادر تشبیہات جدت آمیز استعارات ملتے ہیں، لیکن ان کا

اصلی جوہر جذبات انسانی کی ترجمانی اور مناظر قدرت، کی مصوری میں کھلتا ہے، اپنے مراثی میں انھوں نے ہر عمر اور مرتبہ کے لوگوں کا حال لکھا ہے اور ہر ایک کے جذبات کی صحیح اور سچّی ترجمانی کی ہے، یہیں ان کی سیرت نگاری کا کمال ظاہر ہوا ہے اور اس وصف خاص میں کوئی دوسرا مرثیہ گو ان سے سبقت نہ لے سکا، اسی طرح ظہور صبح، شام، اور صحرا کے جو مناظر ان کے مرثیوں میں ملتے ہیں وہ نقش و نگار کے اعتبار سے مکمل ہیں بیان میں ابتذال کہیں نہیں ملتا، اس دور میں جب لکھنوی شاعر اور لکھنؤ کے شاعر عشق مجازی کی حرف و حکایات اور معاملہ بندی کی خرافات میں مبتلا ہو گئے تھے انیس کے کلام نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں حد سکندری کا کام دیا۔

حضرت امام حسینؑ کا حضرت صغریٰ سے رخصت ہونا

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ پکارے شہ عادل ۔ تیار ہیں رہوار سے یہ سب ہودج و محمل
بے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل ۔ رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل

چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقتِ سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

اب شہر میں اک دم ہی ٹھہرنا مجھے دشوار — ہیں پا بہ رکاب اب در ہو تم صاحب آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار — تکلیف تمہیں دوں یہ مناسب نہیں نہار

غربت میں بشر کے لئے سو طرح کا ڈر ہے
ہبرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام — جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام — دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے تو ہے مجھے انکار — پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار — نبر بد فقط آپ کا ہے شربت دیدار

گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں — اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں — قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں

ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر — ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر — لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھادو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھادو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ
میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نور بصر آنکھوں پہ لے کر تجھے چلتا
تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا
یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمہیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

منہ تکتی ماں کا وہ بیمار بصد غم
چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ موئے ہم
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہ عالم
میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صبح کا سماں

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار — تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار — کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

طلوعِ سحر

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح — ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
ردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

ورشید نے جو رُخ سے اُٹھایا نقابِ شب — در کھل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب
کی فرد فرد سے لے کر حسابِ شب — دفتر کشائے صبح نے الٹی کتابِ شب
گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

پہنچا جو مُہر مہر سے فرمانِ عزلِ شب — گردوں پہ عاملانِ سحر کا ہوا نصب
منشیِ آسماں مع دفتر ہوا طلب — بس جا بجا سے اُٹھ گئی انجم کی فوجِ شب
تا صبح فسردہ فرد میں بیگانگی ہوئی
برخاست کی چراغوں کی پروانگی ہوئی

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں — چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں — مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یاد خدا میں زمزمہ پردازیٔ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو فلک آسماں پر
جاری تھا ذکر قدرتِ حق ہر زباں پہ

وہ سرخیٔ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

گرمی کا سماں

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خسخانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں گل تھے نہ برگ و بار　　ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار　　کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالا کا گماں　　انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں　　تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینہ فلک کو نہ تھی تابِ تپ کی تاب　　چھپنے کو برق چاہتا تھا دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب　　کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

مرزا سلامت علی دبیر

والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے لیکن والد کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے جہاں دستور کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم پائی اور شعر و شاعری میں میر ضمیر کی شاگردی اختیار کی، میر ضمیر خود مصحفی کے شاگرد تھے اس طرح اُن کا سلسلہ بھی انیس کی طرح مصحفی سے جا ملتا ہے۔ میر ضمیر لکھنؤ میں مرثیے کے نئے رنگ کے بانی سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے سب سے پہلے سراپا لکھا، تلوار اور گھوڑے کی تعریف کے علٰحدہ عنوانات قائم کئے۔ غرض انھوں نے فنی حیثیت سے مرثیہ کو مکمل کر کے دبیر اور انیس کے لئے راستہ تیار کیا۔ دبیر نے ۷۴ سال کی عمر پائی، تقریباً تین ہزار مرثیے بے شمار سلام نوحے اور رباعیاں لکھیں سنہ ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔

ان کا انداز انیس سے بالکل جدا ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت تراکیب کے شکوہ، بندش کی درستی پر یہ بہت زور دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا کلام انیس سے زیادہ پُر شوکت و بلند آہنگ ہے مضمون آفرینی اور خیال کی بلندی بھی انھیں کا حصہ ہے۔ بعض حضرات نے دبیر اور انیس کو ایک دوسرے کا حریف اور مقابل قرار دیا ہے۔

حالانکہ دونوں کا رنگ طبیعت اور رنگ سخن جدا جدا ہے۔ انیسؔ کے یہاں سلاست وسادگی ہے۔ دبیرؔ کے یہاں شان وشوکت، دونوں اپنے اپنے رنگ کے استاد ہیں۔ دبیرؔ کے یہاں علمیت اور گہرائی پائی جاتی ہے جو بعض طبائع کو پسند ہے۔ لیکن آورد اور بے جا مبالغہ نے ان کا رنگ پھیکا کر دیا ہے۔ انیسؔ روزمرہ پر جان دیتے ہیں اور بعض حضرات کو اسی میں شاعری کا تمام لطف مضمر نظر آتا ہے۔

طلوعِ سحر

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب　　خورشید کے نشان نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب　　تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی سحر جو زیورِ جنگی سنوار کے
سب نے سپر ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب　　پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ بیضائے آفتاب　　باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب
محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوشِ خوں کے عارضہ میں مبتلا شفق　　فصّادِ صبح آیا لئے نشتر و طبق
کھولی شفق کی فصد تو رنگِ افق تھا فق　　گُل رنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق
خونِ شفق، بس سرخ قضا نے قلم کیا
اور خط و خال روزِ شہادت قلم کیا

صرفِ نگاہداشت ہوا شاہ خوش نہاد　　دفتر کشا نے کھول دیا دفترِ مراد
چہرے صبح کے جو کیا آپ نے رسے صیاد　　کافور ہو گئی شبِ تاریک کی مداد
رتبہ سے سرفراز کیا آفتاب کو
عہدہ ہراولی کا دیا آفتاب کو

طغرا نویس روز نے پھر جس قدر لکھا　　وہ حرف حرف موجبِ حکمِ قدر لکھا
خورشید کو ہراولِ فوجِ سحر لکھا　　حُر کو ہراولِ شہِ والا گہر لکھا
چہرہ تو دو ہراولوں کا ایک جا ہوا
پر حُر کا نام مہر سے روشن سوا ہوا

چاروں طرف تھا بسکہ ہجومِ سیاہ شام　　گویا سیاہ پوش تھا آبِ رواں تمام
ماتم یہ تھا کہ مالکِ کوثر ہے تشنہ کام　　بالکل الٹ دئیے تھے حبابوں نے اپنے جام
منہ پر طمانچے مارتا تھا دستِ موج سے
دریا جو دور پیاس میں تھا شہ کی فوج سے

ظہورِ سحر

جس وقت شمس شمسۂ برجِ فلک ہوا
مشرق سے فرش نور کا مغرب تلک ہوا
شرمندہ ماہ دیکھ کے اس کی جھلک ہوا
عالم میں ذکرِ خالقِ جن و ملک ہوا
شب کی روانگی تھی سحر کا ظہور تھا
ہر جا یہ روشنی تھی ہر اک جا یہ نور تھا

نقارۂ سحر کی کہیں تھی صدا بلند
تھا اک طرف کو نالۂ شیرِ خدا بلند
خیموں میں تھی اذاں کی صدا جا بجا بلند
تھے سوئے حق حسین کے دستِ دعا بلند
نورِ حسین شہ سے عجب آب و تاب تھی
پرنور سجدہ گہ صفتِ آفتاب تھی

ہر یا خدا کے ورد زباں تھا خدا خدا
تھے مرغِ صبح مستعدِ ذکرِ کبریا
دیتے تھے بندگانِ الٰہی کو یہ صدا
جاگو نمازِ صبح پڑھو سو رہے ہو گیا
دیکھو صلوٰۃ قبلۂ اہلِ صلات کو
سجدہ میں اور رکوع میں کاٹا ہے رات کو

دھوتا تھا منہ کنارۂ دریا کوئی عدو
مشغول غسل نہر میں تھا کوئی زشت رو
منظور رخت تن کی کسی کو تھی شست و شو
بستر سے اٹھ کے تھا کوئی آمادۂ وضو
یاں پیاس سے حسینؑ کے اطفال روتے تھے
منہ وقتِ صبح اشکوں سے سادات دھوتے تھے

حضرت علی اصغرؓ کے لئے پانی مانگنا

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰ — لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نہ مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منت بھی گر کروں گا تو کیا دینگے وہ بھلا

پانی کے واسطے میں سگے عدو ہری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو ہری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

گر میں بقولِ عمرو شمر ہوں گنہگار — یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
شش ماہہ ہے بے زبان نبی زادہ شیر خوار — ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہی بیقرار

سن ہی جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زیادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے تمہیں کچھ خیال ہے — دُرِ نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
لوگو تمہیں قسم ذوالجلال ہے — یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے

پوتا علیؓ کا تم سے طلبگارِ آب ہے
دیدو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے
پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر — رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر — سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اُس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

حالی

حالی نے جدید نظمیں لکھ کر زبردست شہرت حاصل کی۔ غالب کے شاگرد رشید کی حیثیت سے حالی کے دل پر غالب کے انتقال نے جو اثر ڈالا ہوگا اس کا اظہار اس مرثیہ میں ہے۔ اگرچہ حالی مرثیے نہ لکھتے تھے لیکن جذبات سے متاثر ہو کر اس مرثیہ میں حالی نے وہ تمام باتیں پیدا کر دی ہیں جو مرثیہ کے لئے ضروری ہیں۔ آمد۔ روانی جوش اور حقیقت سب کچھ اس مرثیہ میں موجود ہے۔

مرثیۂ غالب

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ دان نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر ہمثیل — دل کو کہتا دن اور رات کو رات
ہوگیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اس کا تھا اور اس کی بات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مرگئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے داد سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضمون ہے نوحۂ استاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں — نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی تنبیہ سے بگڑتی تھی — شکل اشکال محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگ ہجران و وصال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا — سخن اس کا مآل کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت
لوح امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالب بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازش خلق کا محل نہ رہا — رحلت فخر روزگار ہے آج
تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع — رخصت موسم بہار ہے آج
بار احباب جو اٹھاتا تھا — دوش احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر ایک بات نیشتر جس کی — اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی — وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دل مضطر کو کون دے تسکین — ماتم یار غمگسار ہے آج
تلخی غم کہیں نہیں جاتی — جان شیریں بھی ناگوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر — ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقد معنی کا گنجداں نہ رہا — خوان مضمون کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہار سخن — اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا ایک ایک کارواں سالار — کوئی سالار کارواں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اس کا — گرم بازار گل رخاں نہ رہا
عشق کا نام اس سے روشن تھا — قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں — گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہل ہند اب کریں گے کس پہ ناز — رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا
زندہ کیوں کر رہے گا نام ملوک — بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا تھا - جو مایہ دار سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا — اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اس نے ادا — پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں — سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جان تک لیکن — در خور ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا — جان دینے پہ اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے — زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست خراب — ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنیِ لفظ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں — آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیت حزن — ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ملک اکثر ہوا ہے بے آئین — اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی — ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رماں میں
حصر تھی اک بیاں پہ رنگینی — کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش — گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوش معنی شنو ہوا بے کار — مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی — شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر — سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہ کامل میں آگئی ظلمت
آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت

احسن مارہروی

حاجی حافظ سید علی حسن احسن مارہروی مشہور درگاہ مارہرہ شریف کے متوسل اور اولیائے کامل کے خاندان کے فرد تھے آغاز شباب سے شعر وسخن کی مشق شروع کی، حضرت داغ دہلوی سے فیض تلمذ حاصل کیا۔ داغ کے آخری زمانے میں حیدر آباد جاکر استاد کے فیض خدمت و صحبت سے سرفراز رہے۔ مولانا احسن اردو کے مسلم محقق و نقاد ہیں۔ اپنے استاد کا دیوان (یادگار داغ) مرتب کیا ولی اورنگ آبادی کا کلیات تصحیح وتحقیق و مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ لشکر اردو اور کسوف الشمسین وغیرہ نظمیں کتابی صورت میں شائع کیں۔

آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے اور اعلیٰ پایہ کے مصنف اور شاعر کی حیثیت سے آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے سلاست روانی اور بلندی تخیل میں آپ ممتاز ہیں۔ داغ کے شاگرد کی حیثیت سے آپنے صفائی اور روانی کا بیحد خیال رکھا ہے مجموعی حیثیت سے آپ داغ کے تمام شاگردوں سے افضل ہیں۔

مرثیۂ داغ

میری وہ دکھ بھری کہانی ہے — جس کو پتھر بھی سن کے پانی ہے
بات کرنی محال ہے گویا — کس میں اب طاقت لسانی ہے

ہوگیا دل کباب جل بھن کر
یہ تپ سوزش نہانی ہے

آج ٹوٹا ہے مجھ پر غم کا پہاڑ
اور کیا وجہ سرگرانی ہے

ہائے کیا بند ہے یہ رقت کا
عید کے روز نوحہ خوانی ہے

کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا
کچھ عجب دور آسمانی ہے

گئے جہاں میزبانِ عیش و نشاط
اب وہاں غم کی میہمانی ہے

بے حلاوت ہے عیش دنیا کا
ہائے کیا تلخ زندگانی ہے

سو برس تک جیے تو کیا حاصل
آخر اک روز موت آنی ہے

ملک الموت کے لئے یکساں
پیری و طفلی و جوانی ہے

نہ رہا ہے یہاں نہ کوئی رہے
ہیچ ہے دنیا سرائے فانی ہے

کیا کسی کو خبر ہو دم بھر کی
کہ ہوا پر بنا ہے اس گھر کی

بے ثباتی جہان کی دیکھی
کچھ نہ خیر اپنی جان کی دیکھی

ہے سرائے جہاں عجیب جگہ
طرز نو اس مکان کی دیکھی

کوئی جی بھر کے رہ نہیں سکتا
رسم یہ اس جہان کی دیکھی

شکل بے مہری فلک کے سوا
نہ کسی مہربان کی دیکھی

ہائے دو بھر ہے چار دن رکھنا
ہمت اس میزبان کی دیکھی

چال سیدھی کبھی نہیں چلتا
کج روی آسمان کی دیکھی

آگیا وقت موت کا جس دم
پھر نہ مہلت اک آن کی دیکھی

زیر ہو دیو مرگ یہ طاقت
نہ کسی پہلوان کی دیکھی

عقل سمجھے نہ اس کی باتوں کو نہ رسائی گمان کی دیکھی
ہم نے لاش آج بے نشاں ہوتے ایک عالی نشان کی دیکھی
نہ رہا میر لشکر اردو یہ تباہی زبان کی دیکھی

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ نظم بے چراغ ہوا

کوئی ایسا دکھائیے توسہی داغ ثانی بتائیے توسہی
محض لفاظیاں نہ مانوں گا لکھ کر ایسا سنائیے توسہی
جو مٹائے نہ مٹ سکے دل سے سکہ ایسا جمائیے توسہی
چاہئے جس جگہ سے پڑھ لیجے اس کا دیوان لائیے توسہی
تو فرضنا وہ تھا نرا جاہل اور ایسا بلائیے توسہی
ہم بھی دیکھیں وہ عالم و شاعر نام دو اک گنائیے توسہی
دوسروں سے مقابلہ کرکے خفتیں کچھ اٹھائیے توسہی
چلئے بس ہو چکے بہت دعوے آنکھ ہم سے ملائیے توسہی
آپ اور اس کی ہمسری تو یہ پہلے صورت بنائیے توسہی
بھول سکتا نہیں اسے کوئی یاد اس کی بھلائیے توسہی
حشر تک نام اس کا چمکے گا داغ کو اب مٹائیے توسہی

کون اس کو مٹانے والا ہے
اس کی باتوں کا بول بالا ہے

کم سے کم مطلع تو کرنا تھا اگر ایسا ہی تجھ کو مرنا تھا

ایک دنیا پڑی تھی اس کے لئے
کیا تجھی پر اجل کا دھرنا تھا

زندگی تیری کس کو بھاری تھی
تجھ کو برسوں ابھی ٹھہرنا تھا

ہے جوانی پہ گرچہ حسنِ سخن
پھر بھی اُس کو ابھی نکھرنا تھا

زیورِ معنی و مضامین سے
کچھ دنوں اور ابھی سنورنا تھا

نقش معنی میں ہے کسر باقی
رنگ ابھی اور اس میں بھرنا تھا

سلک نظم اور اس طرح ٹوٹے
نہ مناسب ابھی بکھرنا تھا

ہیں جو بحرِ سخن میں غرق ابھی
تیرے ہاتھوں انھیں ابھرنا تھا

گوشۂ قبر میں قدم اپنا
جلد اتنا نہ تجھ کو دھرنا تھا

داغ! مہماں سرائے دنیا میں
اور چندے قیام کرنا تھا

لیکن افسوس کیا چلے تدبیر
واقعہ یہ یوں ہی گزرنا تھا

زورِ قسمت سے چل نہیں سکتا!
دل سنبھالے سنبھل نہیں سکتا

الوداع اے کمالِ شعر و سخن
الفراق اے خیالِ خواہشِ فن

کون مضمونِ زلف اب باندھے
کہ طبیعت کو ہے نئی اُلجھن

اب نہ وہ دل رہا نہ ہے وہ اُمنگ
نہ وہ بلبل ہے آہ اب نہ چمن

تازگی باغ شعر میں ہے کہاں
خشک ہے وہ ہرا بھرا گلشن

شعر گوئی تھی بات معمولی
اب ہمیں ہو گئی وہ راہ کٹھن

کیوں نہ یہ راہ ہو کٹھن ہم کو
نہیں استاد و رہنمائے زمن

کون رستہ بتانے والا ہے
رہنما اب ہیں صورتِ رہزن

گرچہ اوروں کے سامنے اب بھی　　نہ جھکے گی کسی طرح گردن
کون ہے اب سپر ہمارے لئے　　کس کے سائے میں ہم رہیں ایمن
ہائے دشمن کو بھی یہ داغ نہ ہو　　کیا بُرا وقت وہ بھی تھا احسنؔ
کہ بتاریخ گفت ایں ناشاد
زجہاں رفت آں جہاں استاد

۱۳۰　　ھ　　۲۲

نظمِ جدید

جدید شاعری نے الفاظ کے مقابلہ میں خیالات پر زیادہ زور دیا اور یہی احساسات کی تبدیلی اور دلی جذبات کے اظہار نے اس صنف کو مقبول بنا دیا۔ انگریزی ادب نے موجودہ دور کے تمام شعرا کو کم و بیش متاثر کیا۔ حالی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور پھر اکبر اور اقبال نے تو پرانی شاعری کو قطعی طور پر ترک کر دیا۔

جدید شعرا اس طرف بہت متوجہ ہیں۔ جدید نظموں میں زندگی کے تمام مسائل شرح و بسط سے بیان کئے جا رہے ہیں۔ ادب اور زندگی میں جو ہم آہنگی ہے وہ اس صنعت سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یقین ہے کہ یہ صنف اور ترقی کریگی۔

نظیر اکبر آبادی

ولی محمد نام، نظیر تخلص، اکبر آباد (آگرہ) کے محلہ تاج گنج سے منسوب ہیں، ولادت کے بارے میں اختلاف ہے، کسی نے دہلی کسی نے پٹنہ

لکھا ہے، سنہ ولادت بھی اختلافی ہے۔ بہرحال جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو یہ آگرہ چلے آئے، اور آخر دم تک وہیں رہے ۱۸۳۰ء میں انتقال ہوا۔

اردو کے قدیم شاعروں میں نظیر اکبرآبادی کا رنگ سب سے علیحدہ ہے۔ وہ اس رنگ کی وجہ سے بجائے قدیم کے دورِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض ناقدین نے انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر اور انگریزی کے مشہور ڈرامہ نگار شیکسپیئر کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ نظیر کی زندگی توکل و استغنا، اخوت و محبت کا مجسمہ تھی۔ وہ ہندوؤں مسلمانوں دونوں سے ملتے تھے اور دونوں کی مجلسوں میلوں ٹھیلوں میں شرکت کرتے تھے، انھیں دلچسپ صحبتوں کا حال انھوں نے اپنی شاعری میں نظم کیا ہے۔ اس طور پر اُن کی شاعری میں اُن کے عہد کی تہذیب و معاشرت کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ نظیر عوام کے پہلے شاعر ہیں۔ انھیں زبان اُردو پر زبردست قدرت ہے۔ اور وہ اُردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے عجیب الفاظ استعمال کرکے اپنے کلام کو دلچسپ اور جاندار بنا دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں نظموں میں اخلاقی تعلیم کا پہلو بے حد نمایاں ہے اور اگرچہ مدت تک اُن کے جوہر لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رہے لیکن موجودہ زمانے میں انھیں اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عید الفطر

ہے عابدوں کو طاعت و تجرید کی خوشی — اور زاہدوں کو زہد کی تمہید کی خوشی
رند عاشقوں کو ہے کئی امید کی خوشی — کچھ دلبروں کے وصل کی کچھ دید کی خوشی
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

روزے کی خشکیوں سے جو ہیں زرد زرد گال — خوش ہو گئے وہ دیکھتے ہی عید کا ہلال
پوشاکیں تن میں زرد سنہری سفید لال — دل کیا کہ ہنس رہا ہے پڑا تن کا بال بال
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

پچھلے پہر سے اٹھ کے نہانے کی دھوم ہے — شیر و شکر سویاں پکانے کی دھوم ہے
پیر و جوان کو نعمتیں کھانے کی دھوم ہے — لڑکوں کو عید گاہ کے جانے کی دھوم ہے
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

محبوب دلبروں سے ہے حسن کی لگن — ان کے گلے سے آن لگا ہے جو گلبدن
سو سو طرح کے چاؤ سے مل مل کے تن سے تن — کہتے ہیں تم کو "عید مبارک ہو جانِ من"
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

کیا ہی معانقے کی مچی ہے اُلٹ پلٹ ملتے ہیں دوڑ دوڑ کے باہم جھپٹ جھپٹ
پھرتے ہیں دلبروں کے بھی گلیوں میں غٹ کے غٹ عاشق مزے اڑاتے ہیں ہر دم لپٹ لپٹ

ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

روزے کی سختیوں میں نہ ہوتے اگر اسیر تو ایسی عید کی نہ خوشی ہوتی دل پذیر
سب شاد ہیں گدا سے لگا شاہ تا وزیر دیکھا جو ہم نے خوب تو سچ ہے میاں نظیر

ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

ہولی

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب حسن دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے
کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ چھیڑیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی اور منہ چنگ بجی
کچھ گھنگرو کھٹکے چھم چھم چھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے
ہر جاگہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

پوشاکیں چھڑکی رنگوں کی اور ہر دم رنگ فشانی ہے
ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں پچکاری کی رخشانی ہے
کہیں ہوتی ہے دھیگا دھینگی کہیں ٹھیری کھینچا تانی ہے
کہیں لٹیاں جھمکیں رنگ بھری کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہر آن سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ و رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

ہیں کیا کیا سوہیں رنگ بھرے اور سوانگ بھی کیا کیا لاتے ہیں
کر باتیں ہر دم چہل بھری خوش ہنستے اور ہنساتے ہیں
کچھ جوگی چیلے بیٹھے ہیں کچھ کا بینوں سے گاتے ہیں
کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں کچھ ناچتے اور گھاتے ہیں
ہر آن نظیر اس فرحت کا سامان دکھایا ہولی نے

خواجہ الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا اس لئے باقاعدہ تعلیم نہ ہو سکی۔ عربی فارسی کی استعداد بقدر ضرورت بہم پہنچائی۔ اسی زمانہ میں اُن کی شادی ہو گئی لیکن تعلیم کا شوق غالب رہا۔ اور یہ دہلی چلے گئے جہاں مولوی نوازش علی سے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں اور پھر پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۵ء کا ہے۔ کچھ دنوں کے لئے ضلع حصار میں قلیل تنخواہ پر ایک سرکاری ملازمت مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جاتی رہی۔ اور کئی سال بیکاری کی حالت میں گزارے۔ آخرکار نواب مصطفٰے خاں صاحب شیفتہ کی مصاحبت اختیار کی اور سات آٹھ سال آرام سے گزارے پھر لاہور جا کر سرکاری بک ڈپو میں ترجموں کی نظرثانی پر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد اینگلو عربک اسکول میں مدرس رہے۔ آخر زمانہ میں حیدرآباد سے وظیفہ مقرر ہونے پر اسکول سے قطع تعلق کر لیا اور باقی عمر سرسید احمد خاں کے رفیق اور ان کی تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے صرف کی۔

مولانا حالی جدید اُردو شاعری کے بانی کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کو عشق و عاشقی کے پرانے قصوں سے نجات دلائی۔ اپنے دیوان پر ایک مقدمہ لکھ کر انھوں نے یہ بتایا کہ شاعری کی حقیقت کیا ہے اور ایک عمدہ شعر میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ "مسدس مد و جزر اسلام" ہے جو انھوں نے سر سید احمد خاں کی تحریک پر لکھا۔ ان کی یہ نظم اُردو شاعری کے گذشتہ پچاس سال کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اس پایہ کا ہے کہ سر سید اسے اپنی نجات کا ذریعہ کہتے تھے۔ حالی نے مثنویاں لکھیں جن میں برکھا رت۔ نشاط امید، مناظرہ رحم و انصاف اور حب وطن بہت مشہور ہیں۔ حالی کی شاعری ہندوستان میں قومی شاعری کی پہلی آواز ہے۔ جس کی صدائے بازگشت ہمیں بار بار اکبر اور اقبال کے یہاں سنائی دیتی ہے۔

خودستائی

اے دل! بشرہ کون ہی جو خودستا نہیں
پر خودستائیوں کے ہیں عنوان جدا جدا
جو زیور خرد سے معرا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو طرح سے وہ
پردے میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
کہتا ہی ایک کیسی حماقت ہوئی ہی آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دے دیا

کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل بھی ڈپٹ میں پہنچ دیا مال جب کھا

پردے میں نیکی کے چھپاتا ہے بخل یہ
اور بن کے بے وقوف جتاتا ہے وہ سخا

سمجھے ہیں یہ کہ ہم بھی انھیں میں سے ہوں شمار
اہل وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا

سمجھو اس لیے کہ اپنا ہو انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا

کہتا ہے ایک لاکھ نہ مانے برا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا

کہتا ہے ایک گرچہ ہی خوشامد کا اور ہی
پر جانتے آدمی کو ہیں کہہ سکے ہم برا

دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
اور منہ سے دور کھینچ کے دکھاتا ہے وہ صفا

چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیاں ہے سب راست اور بجا

کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ
انکے خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا

قائل ہے وہ انھیں پہ ہے وصف جو بیاں
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید عمر ہے شہد سے سادہ لوح
گنتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا برا

کہتا ہے عمرو زید بھی کتنا ہے عیب میں
بد ہو کہ نیک اس کی زباں سے نہیں بچا

یہ اس کا اور وہ اس کا بیاں کرکے کوئی عیب
ہر اک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا

نیت اگر یہ ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پتلا نہ خودستا

حالی تمیز سے [illegible] رہے ہیں جہان سے
شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مدعا

یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا

القصہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مبتلا

ہندوستان

اے حصارِ عافیت اے کشورِ ہندوستان
زیب دیتا ہے اگر کہئے تجھے سارا جہاں

اک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوارِ کوہ
موجزن ہے ایک جانب تیرے بحرِ بیکراں

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا
ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں

بحر میں ہوتا ہے اک شورِ قیامت آشکار
جبکہ اس میں آکے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

خوف باہر کا ہے تجھ کو اور نہ کچھ اندر کی فکر
دستِ گلچیں نارسا و نخلِ دولت گلفشاں

تو نے فارغ کر دیا ہے فتحِ ملکِ غیر سے
پھر ضرورت کیا کہ کھولیں بے سبب تیرا نشاں

چل رہی ہے امن کی ہر سو ہوائے خوشگوار
ہو نہ اب کہہ دو خزاں سے رخنہ اندازِ بہار

اے مقدس آریہ ورت آئی کیا تجھ پر بلا
جس نے بزمِ یک دلی کو تیری برہم کر دیا

کوچ کر جاتا نہ تجھ سے گر وفاق و اتحاد
کون تھا جو تیری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھتا

تو کہاں اور اہلِ مغرب کے بھلا حملے کہاں
ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھ کو سزا

گو تری اولاد میں ہوتا سلوک و آشتی
لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگامِ وغا

گھاٹیوں میں آکے جب ہوتی فراہم تیری فوج
ہوش کھو دیتی سمِ اسپانِ ہندی کی صدا

بھاگنا بھی دشمنوں کو واں سے ہو جاتا محال
دیکھتے جب ہر طرف سے آمدِ سیلِ بلا

یا اطاعت کرتے اور لڑنے سے باز آتے وہیں
یا اگر کرتے بہت ہمت تو مر جاتے وہیں

ہند کا حق تھا کہ ہوتی مہر و الفت کی زمیں | قوم کے ہمدرد ہوتے اس مکاں کے سب مکیں
حیف جس مٹی سے اُگنا چاہیے تھا نخلِ مہر | جم گیا آپ ہی ہوائے دہر سے واں نخلِ کیں
ہر طرف تختے لگے خودرو کے جس جنگل میں تھے | غور سے دیکھا تو پنہاں تھے درندے بھی وہیں
امن قائم تھا طلوعِ صبح کے آغاز میں | جتنا دن چڑھتا گیا ہوتا گیا عزلت گزیں
دیوتا جو آریہ کے زعم میں فانی نہ تھے | فانیوں کی طرح یاں آ کر رہے وہ بالیقیں
جنگ و خونریزی کے خود آ کر ہوئے وہ رہنما | ورنہ فتنے کا قدم تک یاں نہ آیا تھا کہیں

یک بیک آیا خلل امن و اماں میں ہر طرف
اک تنزل پڑ گیا ہندوستاں میں ہر طرف

اقبال مندی

الپ ارسلاں سے یہ طغرل نے پوچھا | کہ قومیں ہیں دنیا میں جو جلوہ فرما
نشاں ان کی اقبالمندی کے ہیں کیا | کہ اقبالمند ان کو کہنا ہے زیبا

کہا ملک و دولت ہو ہاتھ ان کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ اُن کے جب تک

جہاں جائیں وہ سرخرو ہو کے آئیں | ظفر ہم عناں ہو جدھر باگ اٹھائیں
نہ بگڑے کبھی کام جو وہ بنائیں | نہ اکھڑے قدم جس جگہ وہ جمائیں

کریں مس کو گر مس تو وہ کیمیا ہو
اگر خاک میں ہاتھ ڈالیں طلا ہو

ولی عہد کی جب کہ باتیں سنیں یہ   ہنسا سُن کے فرزانہ دوربیں یہ
کہا جانِ عم گپ ہے گو دل نشیں یہ   مگر شرطِ اقبال ہرگز نہیں یہ
حوادث سہے بن گذارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

بہم ہے کبھی گاہ برہم ہے محفل   کٹھن ہے کبھی گاہ آسان ہے منزل
زمانہ کی گردش سے بچنا ہے مشکل   نہ محفوظ ہیں اس سے مدبر نہ مقبل
بہت یکہ تازوں کو یاں گھرتے دیکھا
سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا

جہاں سود ہے یاں وہاں ہے زیاں بھی   جہاں روشنی ہے وہاں ہے دھواں بھی
سقر بھی ہے یہ خاکداں اور جناں بھی   بہاریں بھی ہیں اس میں اور ہے خزاں بھی
نکھرتے ہیں جو یاں وہ گدلاتے بھی ہیں
چمکتے ہیں جو یاں وہ گہناتے بھی ہیں

ضعیف اور قوی ارمنی اور عراقی   چکھاتا ہے دردِ قدح سب کو ساقی
یہ اقبال کی ہے رمق جن میں باقی   یہ سب تلخیاں ان کی ہیں اتفاقی
بلاؤں میں گھر کر نکل جاتے ہیں وہ
ذرا ڈگمگا کر سنبھل جاتے ہیں وہ

نہیں ہوتے نیرنگ گردوں سے حیراں   ہر اک درد کا ڈھونڈھ لیتے ہیں درماں
اٹھاتے نہیں کچھ حوادث سے نقصاں   وہ چونک اٹھتے ہیں دیکھ خواب پریشاں

بھڑکتے ہیں افسردہ ہو کر سوا وہ
جھپکتے ہیں پژمردہ ہو کر سوا وہ

پگھلتے ہیں سانچے میں ڈھلنے کی خاطر　　لگاتے ہیں غوطہ اچھلنے کی خاطر
ٹھہرتے ہیں دم لے کے چلنے کی خاطر　　وہ کھاتے ہیں ٹھوکر سنبھلنے کی خاطر
سبب کو مرض سے سمجھتے ہیں پہلے
اُلجھتے ہیں پیچھے ۔ سلجھتے ہیں پہلے

ضرورت نہیں یہ کہ فرماں روا ہوں　　رعیت ہوں وہ خواہ کشور کشا ہوں
سپاہی ہوں تاجر ہوں یا ناخدا ہوں　　وہ کچھ ہوں پہ اپنے سے واقف رہا ہوں
کہ ہم کیا ہیں اور کون ہیں اور کہاں ہیں
گھٹے یا بڑھے ہیں سُبک یا گراں ہیں

جب آئے انھیں ہوش کچھ وقت کھو کر　　رہیں بیٹھ قسمت کو اپنی وہ رو کر
کریں کوششیں سب بہم ایک ہو کر　　رہیں داغ ذلت کا دامن سے دھو کر
نہ ہو تابِ پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص ۱۸۴۶ء میں بارہ ضلع الہ آباد میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام میر تفضل حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم سرکاری مدارس میں حاصل کر کے ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان دیا اور درجہ اوّل میں کامیاب ہوئے، نائب تحصیلدار، منصف اور جج خفیفہ کے عہدوں پر فائز رہ کر ۱۹۰۳ء میں پنشن لے لی، اس کے بعد خالص علمی زندگی بسر کرتے رہے ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔

حالی کے بعد قومی شاعری کی تاریخ میں اکبر ہی کا نام لیا جاتا ہے لیکن حالی میں اور ان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ حالی کا کلام ایک مرثیہ ہے جس میں قنوطی جذبات کی فراوانی ہے۔ اکبر سمجھتے تھے کہ قومی اصلاح میں قنوطیت کی بجائے رجائیت اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے انھوں نے طنز و ظرافت کو اصلاح معاشرت کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے، جدید انگریزی تعلیم، مغربی معاشرت کی کورانہ تقلید، بے پردگی اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر انھوں نے اسی رنگ میں خامہ فرسائی کی ہے، اس لئے ان کا کلام خشک، وعظ و پند بن کر نہیں رہ گیا ہے۔ اس میں شاعرانہ لطافت بدرجہ کمال موجود ہے۔

اکبر۔ حالی اور اقبال کے درمیان سلسلہ کی ایک کڑی ہیں اس لئے ان کے کلام کا مطالعہ شاعری کے طالب علم کے لئے نہایت ضروری ہے۔

لبِ ساحل

دور کوہ لبِ ساحل سے جو گذری اک موج
کوہ نے اس سے کہا "تو نے نہ دیکھا مرا اوج
مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دمِ چند"
بولی "سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند
ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل
اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل
ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب
"پوچھئے موج سے ہے بھی اسے رُک جانے کی تاب
اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تعلّی کیسی؟
اضطراری ہے روش شانِ ارادی کیسی؟"
بہ گئی موج یہ کہہ کر کہ "میں مغرور نہیں
تجھ میں اے کوہ مگر روشنیٔ طور نہیں
بلبلہ ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

کانفرنس

کانفرنس احباب سے پُر ہے — جو صف ہے وہ سلکِ دُر ہے
سب کو یادِ اُستاد کا گُر ہے — دل کش ہر اِک اسپیچ کا سُر ہے

قومی ترقی کی رادھا پیاری — بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری — چندے کی تحصیل ہے جاری

جمع ہیں ممبر بھولے بھالے — جاڑوں کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے — چندہ دے کر پھنسنے والے

بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں — بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں — کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں

مدعیانِ رونقِ دیں ہیں — لیکن باہم برسرِ کیں ہیں
واقفِ فن و ہنر سے نہیں ہیں — کم ہیں ان میں جو آخر بیں ہیں

ہر دم قوم کا رونا کیا ہے — ان باتوں سے ہونا کیا ہے
مفت میں روپیہ کھونا کیا ہے — شور زمیں میں بونا کیا ہے

دیکھ کے اک باضابطہ بھبکی
دُنیا آپ کی جانب لپکی
آپ نے سب کی دولت ہپ کی
بزمِ جمالی خالی گپ کی

یہ وادی ہے طُور سے خالی
یہ محفل ہے نُور سے خالی
یہ جنّت ہے حُور سے خالی
پاس سے خالی دُور سے خالی

دیکھتا ہے اک عمر سے بندا
بس یہی باتیں اور یہی پھندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا
لاؤ چندہ لاؤ چندا

سیّد کا جو عہدِ مشن تھا
اس سکّے کا ٹھیک چلن تھا
حسبِ ضرورت طرزِ سخن تھا
وقت وہ اور تھا اور ہی سِن تھا

بگڑا دیکھا بیٹا بھتیجا
ایک کا چہلم ایک کا تیجا
دل کہتا ہے بات کو پی جا
ساکت ہو دِکھلا کے نتیجا

بھائیوں پر منہ آئے جانا
گائے گیت کو گائے جانا
اگلا قصّہ سُنائے جانا
اُترا ڈھول بجائے جانا

بیٹھے روتے ہیں جن کے لڑکے
دوڑتے تھے ہیں بنگلوں پہ تڑکے
دل میں یہی رہتے ہیں دھڑکے
مار نہ بیٹھے کوئی بگڑ کے

کیوں رنگ حق پوش میں آؤ غیرت پکڑو جوش میں آؤ
مذہب کے آغوش میں آؤ غافل بندو ہوش میں آؤ

ایک انگریز نے بات یہ کہہ دی جس نے ترقی وہ دی یہ دی
اس بازی کی ہمیں نے شہ دی کیسے سید کیسے مہدی

گرمیوں میں بچوں کو تھکانا شہروں شہروں بھیک منگانا
اور اس پہ یہ بات بنانا مفلس لڑکوں کا ہوگا ٹھکانا

آپ کہیں معیوب نہیں ہے ہم کو تو مرغوب نہیں ہے
عمدہ یہ اسلوب نہیں ہے ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے

اس سے بگڑتی ہے قومی حالت جاتی رہتی ہے شرم کی خصلت
کہتے ہو ہوگی جو یہ جمعیت ہوگا میل بڑھے گی الفت

تڑپو گے جتنا جال کے اندر جال گھسے گا کھال کے اندر
کیا ہوا تیس ہی سال کے اندر غور کرو اس حال کے اندر

کام بہت ہیں لوکل و ذاتی ان کی فکر تو کی نہیں جاتی
مفت میں بچوں کو کرکے براتی قوم کی گاتے ہیں بھائی وفاتی

کینہ ہم کو ہے نہ حسد ہے   دل میں ضد ہے نہ کوئی کد ہے
لیکن یہ ارشاد خرد ہے   بھلائی ہر شے کی ایک حد ہے

یہ بے معنی مجلس کیسی   یہ ناحق کی گھس گھس کیسی
یہ بے حکم کی آفس کیسی   بات یہ سٹرم پوٹیس کیسی

ہو گیا عقل میں کون اضافہ   خوش یہ بھیلی نہ دیکھا نافہ
دیکھ لیا یاروں کا قیافہ   پایا بس خوش رنگ لفافہ

قوم سے اس کی گاڑھی کمائی   آپ نے فقرہ دے کے اڑائی
اور وہ یوں بے سود گنوائی   شاہ لندن تیری دہائی

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے   قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے   تاکہ گھٹیں افلاس کے ہیشے

تم ہو فکر جاہ میں الجھے   شہرت و شان کی چاہ میں الجھے
ناقصوں کی واہ میں الجھے   دل کیوں کر اللہ میں الجھے

خالق کی توحید سکھاؤ   عقبیٰ کی تمہید سکھاؤ
ملحد کی تردید سکھاؤ   روحانی امید سکھاؤ

مذہب کی تعلیم زبانی　　طوطا مینا کی ہے کہانی
مُلّا جو خود نہ ہوا حقانی　　پھر تو مکتب ہے شیطانی

جب ہوں گرو جی خود البیلے　　خوب رچائیں میلے ٹھیلے
راہ پہ آئیں کیوں کر چیلے　　مندر میں کیوں جائیں اکیلے

اگوا خود جب حق سے ہو غافل　　دنیا ہی دنیا دل میں ہو داخل
ساتھی کیوں نہ چلیں رہِ باطل　　کیوں کر دین ہو ان کو حاصل

جس نے خیمہ یہاں پر گاڑا　　اس کو مبارک ہو یہ اکھاڑا
لیکن قوم کو کیوں ہے پچھاڑا　　اس نغمے نے گلا کیوں پھاڑا

اقبال

اقبال موجودہ دور میں اُردو شاعروں کے سرتاج ہیں۔ ان کی ولادت ۱۸۷۶ء میں بمقام سیال کوٹ (پنجاب) ہوئی۔ ایف۔ اے تک وطن میں تعلیم پائی پھر لاہور آ کر بی۔ اے کی ڈگری لی۔ کچھ دنوں اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں ملازم رہے ۱۹۰۵ء میں تکمیل تعلیم کے لئے ولایت گئے اور ۱۹۰۸ء تک قیام کیا۔ اس کے بعد واپس آ کر اپنی زندگی شاعری کے ذریعے اصلاح قوم کے لئے وقف کر دی ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا۔

اقبال کی تصانیف اُردو میں (۱) بانگ درا (۲) بال جبریل اور (۳) ضرب کلیم ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اُردو کلام ان کے آخری مجموعہ ارمغان حجاز میں بھی شامل ہے لیکن کلام کا زیادہ اور اہم حصہ فارسی زبان میں ہے یعنی (۱) مثنوی اسرار خودی و رموز بیخودی (۲) جاوید نامہ (۳) زبور عجم (۴) پیام مشرق (۵) مثنوی مسافر (۶) متفرق کلام فارسی جو ارمغان حجاز میں شامل ہے۔

اقبال کی شاعری کا اصلی مقصد انسان کو اس کی زندگی سے واقف کرانا ہے تاکہ وہ اپنی تخلیق کے مقاصد اپنی قوتوں کی حدود اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح واقف ہو سکے۔ انھوں نے زندگی کے ہر اہم مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے ان کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی دراصل حرکت اور عمل کا

نام ہی جو قومیں زندہ ہیں وہ اپنے عمل اور جد وجہد کی وجہ سے زندہ ہیں کاہلی اور سکون موت کا پیام ہے۔ ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے تاکہ اس کی جماعت کا نظام مضبوط ہو سکے۔ نسل، قومیت رنگ اور اس قسم کے اختلافات بے کار ہیں۔ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے رشتہ میں منسلک ہونا چاہیئے دنیا کے موجودہ نظام میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ انسان اب تک انسان کا غلام ہے۔ اب اسے آزاد ہونا چاہیئے۔ ہمارا ملک اب تک دنیا کی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔ کمزوری کا اصلی سبب آپس کا نفاق ہے اسے دُور کرنا چاہیئے۔

اقبال کا کلام دراصل اُمید کا ایک پیام ہے۔ ان کی شاعری میں ایک درخشاں صبح کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی مایوسی اور ناکامی کا حرف زبان پر نہیں لاتے بلکہ تاریک ترین لمحات میں ان کی نظر روشنی کے آثار دیکھ لیتی ہے صحیح معنوں میں وہ اس دور کے خضر اور رہنما ہیں۔ ان کا شمار صرف اُردو کے شاعروں میں ہی نہیں وہ دنیا کے ایک بڑے شاعر اور مفکر ہیں ان کی شاعری کی نمایاں اور اہم ترین خصوصیت، ان کی جدت پسندی اور جدت طرازی ہے۔ جدّت استعارات و تشبیہات۔ جدّت تخیل اور طرز ادا ان کے کلام کی خصوصیات ہیں سلیس اندازِ کلام۔ شگفتہ اور رنگین تراکیب۔ تغزل اور ترنم۔ خیالات میں گہرائی اور بلند آہنگی ان کے کلام کے محاسن اور ممتاز خصوصیات ہیں۔

اقبال ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے یہ اور بات ہے کہ ضمنی حیثیت

سے یہ پہلو بھی ان کا مضمون ہو۔ وہ اصلاح، ترقی، حرکت، عمل، خودی اور خود داری کو انسانیت کا جوہر جانتے تھے اور ان کی شاعری کا یہی مقصد تھا۔ اقبال اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور ساری دنیا ان کی عظمت کی قائل ہے۔

چاند

اے چاند! حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے — طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں — عاشق ہے تو کسی کا! یہ داغ آرزو ہے!
میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تو فلک پر — تجھ کو بھی جستجو ہے، مجھ کو بھی جستجو ہے

انساں ہے شمع جس کی محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں منزل وہی ہے تیری

تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خامشی میں — پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے، سبزہ میں سو رہا ہے — بلبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں
آ! میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا — نہروں کے آئینے میں شبنم کی آرسی میں

صحرا و دشت و در میں کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

بزمِ انجم

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو / طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور / قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی / چمکے عروسِ شب کے موتی وہ پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے / کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"

محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی

اے شب کے پاسبانو، اے آسماں کے تارو! / تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرود ایسا، جاگ اٹھیں سونے والے / رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں / شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمہاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

"حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں / جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا / منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا / قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم / داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے / جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں"

صبحِ چمن

پھول

شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا
اے قاصدِ افلاک! نہیں! دور نہیں ہے!

شبنم

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

صبح

مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ
آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن
ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

پھول

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغامِ خجالت دے
نہ رہ منت کشِ شبنم، نگوں جامِ وسبو کر لے

نہیں یہ شانِ خود داری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

اگر منظور ہے تجھ کو خزاں ناآشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

اسی میں دیکھ! مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے

تصویرِ درد

دکھا دو حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو رُلواتا ہے شبنم کو

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

نہ اُٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گُل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

پھرا کرتے نہیں مجروحِ اُلفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر دُکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

شراب بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بُو رہنا

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

پنڈت برج نرائن چکبست

ان کی ولادت ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد ہوئی، لیکن بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا۔ یہ چند سال بعد وہیں آ گئے اور تعلیم پائی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی ۱۹۰۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے قانونی پیشہ اختیار کیا اور بہت جلد ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں ہونے لگا ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے بریلی تشریف لے گئے، واپسی میں وہیں اسٹیشن پر دماغ پر فالج گرا اور ویٹنگ روم میں ہی انتقال ہو گیا۔ لاش لکھنؤ اسی روز رات کو ۱۱ بجے لائی گئی۔

بچپن سے شاعری کے شوقین تھے کہا جاتا ہے کہ پہلی غزل نو سال کی عمر میں کہی۔ غزل اور مسدس سے خاص لگاؤ تھا۔ غزل میں آتش کا رنگ اور مسدس میں انیس کا انداز پسند ہے۔ زبان کی صفائی، محاورہ کی برجستگی اور حسن ترکیب جو عام طور پر لکھنوی شعراء میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں بھی ہے۔ کلام کا بیشتر حصہ قومی رنگ کی نظموں پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کا حب وطن، قومی درد اور اصلاح کا جذبہ ہر قدم پر کارفرما ہے۔ ان کی نظموں میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی بڑے دل کش اور حسین پیرائے میں پائی جاتی ہے۔

سیر دہرہ ڈون

فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے
بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے

بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے

اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر
شجر و حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں

وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر
ہوس بھی روح کو مل جائے اس میں لے ہو کر

حریم خاص میں قدرت کے باریابی تھی
نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی

نشست سنگ یہ بھی سایۂ شجر کے تلے
رواں تھا چشمۂ آب خنک نظر کے تلے

شریک حال بھی وضع قدیم قدرت کی
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی

شراب نور حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار

درخت کوہ میں کیا ذات پاک انساں کیا
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر باراں کیا

یہ موج ہستی بیدار کے عناصر ہیں
سب ایک قافلہ شوق کے مسافر ہیں

یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں بیر نہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں

انہیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج ہستی میں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی میں

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنے راز نہیں
یہ کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں

ہے جسم خاک یہاں اس کا جسم فانی ہے
جو روح ہم میں ہے اس میں وہی روانی ہے

رامائن کا ایک سین

(راجہ رامچندر جی کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بےگناہ
نورِ نظر یہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا
افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا
وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

روکر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیجدوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید — اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی اُمید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید — سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم — ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم — تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گذارے ہیں ماہ و سال — دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال — آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کیواسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کیواسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر — گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنا جو بے ثمر — یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اُجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ

آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ
اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ

تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز

عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز

سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور

صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر

اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر

خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار | واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار | ماتم کدہ ہے دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب | جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوز دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب | پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی | قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی | ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال | ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گذرتے ہی ماہ و سال | خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار | کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہگار | یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام

اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انھیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائیگاں

رکھتے ہیں جو عزیز انھیں اپنی جان کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار
وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار

ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندہ کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

جوشؔ ملیح آبادی

سید شبیر حسن خاں نام، جوشؔ تخلص قصبہ کنول ہار میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے بچپن میں یتیم ہو گئے اس لئے تعلیم و تربیت نہ ہو سکی۔ لیکن شعر و سخن کی طرف جو فطری رجحان تھا وہ شغف کے درجہ تک پہنچ چکا تھا۔ مذاق سلیم اور فطری ذہانت کی بدولت اتنی ترقی کی کہ موجودہ زمانہ کے صاحبانِ طرز شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کچھ دنوں بعد دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں ادبی خدمات و تالیفات اور ترجمے کئے۔ پھر کچھ عرصہ تک ایک رسالہ "کلیم" دلی سے نکالتے رہے۔ اب لکھنؤ میں قیام کرتے ہیں اصنافِ سخن پر آپ کو قدرت حاصل ہے لیکن شہرت آپ کی نظموں کی ہی بدولت ہے۔ آپ کی نظمیں جذبات سے بھری ہوئی ہوتی ہیں اور کلام میں غضب کا زور ہوتا ہے نظمیں رنگینی اور ندرت تخیل کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ اکثر نظموں میں اصلاحی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اچھوتی اور خوبصورت تشبیہیں، حسین ترکیبیں آپ کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ اور یہی آپ کے کلام کی جان ہیں۔ آپ موجودہ شعراء میں سب سے بہترین نظمیں لکھتے ہیں۔

کہاں تک

آشفتہ سری اے دلِ ناکام کہاں تک؟
یہ شکوۂ بے مہریِ ایّام کہاں تک؟
دارائے اسلاف پہ تا چند یہ ماتم؟
انجامِ تنعّم پہ یہ کہرام کہاں تک؟
اس درجہ گردشِ افلاک سے خائف؟
یہ وسوسۂ فتنۂ ایّام کہاں تک؟
پروانہ صفت جھونک بھی دے آگ میں خود کو
آغاز میں اندیشۂ انجام کہاں تک؟
اے رہبرِ گمراہ! یہ غدّاریاں تا چند؟
اورنگِ زمانہ ہوسِ نام کہاں تک؟
اُٹھ رہ گئے آغوش میں ہی نغمۂ شیریں؟
یہ سازِ طرب کی ہوسِ خام کہاں تک؟
آصر صروسیلاب میں ہے روحِ شبستاں
یہ ذوقِ شبِ ماہ و لبِ جام کہاں تک؟
جو دوڑ میں پیچھے تھے بہت بڑھ گئے آگے
اے پائے طلب! رشتۂ اوہام کہاں تک؟

گردوں پہ حریفوں نے بنائے ہیں نشیمن
اے پست نظر! اسیرِ لبِ بام کہاں تک؟

ہمت ہے تو مطلوب سے خود کیوں نہیں ملتا
یہ سلسلۂ نامہ و پیغام کہاں تک؟

ہاں دیکھ حریفوں کے چھلکتے ہوئے ساغر
اے تشنہ دہاں! دُردِ تہِ جام کہاں تک؟

کیوں قوتِ پرواز پہ ایماں نہیں لاتا؟
اے مرغِ قفس! نالۂ تہِ دام کہاں تک؟

خود خوشۂ انگور نچوڑا نہیں جاتا
اغیار سے دریوزۂ تک جامِ کہاں تک؟

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

دشت کے کامِ دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ

زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنید
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلہ

خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان

دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور

پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نیم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل

خوش نما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغِ جوہردار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زرنارِ چمن کو صبحِ درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے الہڑ سی زمیں

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں ہے ادھر
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نظر

پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی ناہموار دیوی کا شبابِ سوگوار

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

احسان بن دانش

آپ کاندھلہ ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے۔ والد کے نام کی رعایت سے اپنے نام کے آگے دانش کا اضافہ کیا۔ ابتدائی تعلیم اسکول میں حاصل کی آج کل لاہور میں ایک مکتبہ کے مالک ہیں اور یہی آپ کا ذریعہ معاش ہے۔

احسان کی نظموں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اقبال سے اکتساب کیا ہے۔ ان کی اکثر نظمیں اقبال کے انداز میں ہیں۔ ان کی تشبیہیں اور استعارات اکثر اچھوتے اور بہت دلآویز ہوتے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب عام طور پر موضوع کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی ان کے کلام کی قبولیت کا راز ہے۔ مشاعروں میں ان کا نام سن کر لوگ زیادہ جاتے ہیں۔ ان کی نظموں سے محفل مشاعرے میں کافی گرمی آجاتی ہے۔ کچھ تو ان کی دلپذیر نظموں کی وجہ سے دوسرے ان کے سادہ مگر عمدہ پڑھنے کی وجہ سے۔

مزدور کی لاش

یادِ ایام کہ اک دن تھی گھٹا چھائی ہوئی
زلفِ برسات کے شانوں پہ تھی لہرائی ہوئی

دن کے چہرے پہ ملاحت تھی مگر شام نہ تھی
روشنی سی تھی در و بام پہ شرمائی ہوئی

مست جھونکوں کا تقاضا تھا "چلے جام چلے"
توبہ پھرتی تھی خیالات میں گھبرائی ہوئی

نور سا جاگ رہا تھا مری شریانوں میں
پشتِ غم بارِ پشیمانی سے تھی خم کھائی ہوئی

جا رہا تھا میں عجب رنگ میں سرشارِ خیال
دل پہ کیفیتِ الہام سی تھی چھائی ہوئی

چلتے چلتے جو قریب آ گیا اناٹمی ہال
بارش اتری جو گھٹاؤں میں تھی منڈلائی ہوئی

دیکھتا کیا ہوں کہ ہر سمت سے جو آتا ہے
تیز نشتر لیے اک لاش پہ جھکتا جاتا ہے

اور اس کا کوئی اس حالِ پریشاں میں نہیں
جو یہاں ہے وہ سماں گورِ غریباں میں نہیں

جم گیا خون، رکی سانس، رگیں بیٹھ گئیں
رنگ اُمید کا اس نقشۂ حرماں میں نہیں

چھن گئی دولتِ گفتار، لٹی جنسِ حیات
اب بجز خاک کچھ اس خاکِ انساں میں نہیں

جسم پر نشتر و مقراض ہیں سرگرمِ عمل
گرمیِ زیست کسی تارِ رگِ جاں میں نہیں

پھیپھڑے آتے ہیں سینے کے شگافوں سے نظر
اب وہ دھڑکن وہ حرارت دلِ بیجاں میں نہیں

رنگ بھی جسم کا تبدیل ہے، اعضا بھی خراب
اُف بھی اُس پیکرِ مجبور کے امکاں میں نہیں

تیرتی ہے رگ و ریشہ میں محقق کی نظر
پردہ پوشی کی سکت بھی تنِ عُریاں میں نہیں

میں تھا حیران کہ یہ درویش ہے یا غازی ہے
کس کو یہ بعدِ فنا دعویِٰ جانبازی ہے

خود کو یوں وقف کیا کس نے زمانے کے لئے
کون بے چین تھا اس رنگ میں آنے کے لئے

قید تربت ہے یہ کس مرد کو سوجھا ہی گریز
کون پاتا ہی میزوں کو سجانے کے لئے

سوز ما کون یہ خدمت کے جنوں میں نکلا
کس مجاہد کا جگر ہے یہ نشانے کے لئے

کس کی فطرت میں تھی یہ حسرت پیکان ستم؟
جسم کے راز نہفتہ کو بتانے کے لئے

کس کی آنکھوں نے اٹھائے ہیں نگاہوں سے حجاب
مٹ گیا کون دماغوں کو بسانے کے لئے

کس کی جیب ہو گئی مشاطۂ گیسوئے خیال؟
کون خوابیدہ ہے عالم کو جگانے کے لئے

کس کی ہر رگ میں تھی فضا دنوازی کی تڑپ
گم ہے یہ کون رہ عالم دکھانے کے لئے

سو گیا کون بتا کر یہ چراغ ہستی
بزم اذہان میں فانوس جلانے کے لئے

کون آیا ہی یہ ظلمت کے دھندلکوں کی طرف
روئے فطرت سے نقابات اٹھانے کے لئے

میں نے پوچھا کوئی عالم تھا کہ منصور تھا یہ؟
بولا اک شخص کوئی دور کا فرد و تھا یہ؟

دل مرا اک ہوک اٹھی جوش محبت لے کر
اشک آنکھوں میں ابل آئے حرارت لے کر

آئے فرد و ازل ہی سے تقدس یکبار
اٹھے منعم زر و تمکین کی قوت لے کر

موت کا حال مگر اہل و دل سے پوچھو
ہاتھ ملتے گئے دل میں غم دولت لے کر

موت کی گود میں فرد و کو نیند آتی ہے
باغ فردوس اترتے ہیں بشارت لے کر

مالداروں کو لحد میں بھی ہے اک حبس دوام
فاقہ مست آگئے ہیں آزاد طبیعت لے کر

ان کے ڈھیروں یہ شعاعوں کی ہے ناوک فگنی
مسکراتی ہیں بہشتیں گود میں عصمت لے کر

ان کے بیوا تو ایوانوں کی ہوتی ہے نمود
راہ پاتے ہیں یہاں آتے ہیں اجازت لے کر

سرمۂ منت نظر ہے یہاں باطن کی جلا
جو یہاں آتے ہیں جاتے ہیں بصیرت لے کر

میں بھی شاید کہ یہیں آ ڈوں گا
اسی عبرت کے تلاطم میں سما جاؤں گا

علی نقی صفی لکھنوی

علی نقی نام، صفی تخلص، سادات زیدی میں سے ہیں، آبا و اجداد غزنی سے آکر دہلی میں آباد ہوئے۔ یہاں سے صفی کے جد امجد سید احسان علی فیض آباد چلے آئے۔ پھر خاندان لکھنؤ چلا آیا جہاں ۱۸۶۲ء میں صفی کی ولادت ہوئی، پہلے عربی، فارسی کی تکمیل کی، اس کے بعد کچھ انگریزی پڑھی ۱۸۸۳ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور ۱۹۲۳ء تک مختلف محکموں میں رہ کر پنشن لے کر۔

مولانا صفی نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھی ہیں، غزلوں میں عاشقانہ مضامین سادگی اور صفائی کے ساتھ نظم کرتے ہیں، سوز و گداز جو ایک طور پر غزل کے عناصر اصلی میں داخل ہے خوب نمایاں ہے لیکن تہذیب و متانت کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، زبان نہایت سادہ نرم و شیریں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن غزلوں سے زیادہ صفی کی نظموں نے شہرت پائی ہے۔ ان میں بعض تاریخی اور جغرافیائی مقامات سے متعلق ہیں۔ ان نظموں میں دلکشی اور ترنم پایا جاتا ہے۔ فارسی، عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ بھی جا بجا ملتے ہیں جس سے ان کے کلام میں ایک اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ بعض نظمیں قومی ہیں جن میں قوم کو بیدار کرنے کے لئے طرح طرح سے خطاب کیا ہے۔

تاروں بھری رات

نظر کے سامنے ہے اک طلسمات
تری کیا بات اے تاروں بھری رات
ستارے ہیں کہ نازک آبگینے
رواں یا بحرِ اخضر میں سفینے
یہ انجم یہ فضائے چرخِ اخضر
سمندر میں بطیں جیسے شناور
ستارے جن کے ہر سو غلغلے ہیں
یہ سب بحرِ فنا کے بلبلے ہیں
ثبات ان کو نہیں دنیا میں زنہار
یہ جیتے ہیں ثوابت اور سیّار
جو ان کی گردشوں پہ کیجیے غور
ہر اک کا ان میں سے محدود ہے دور
لبوں پر ہے تحیّر کا ترانہ
کسی کا ہے یہ دہر آئینہ خانہ
خدا جانے سرِ منزل کہاں ہے
رواں دن رات یونہی کارواں ہے
فلک ہے یا کوئی لوحِ زبرجد
مرصّع کاریاں جس پر ہیں بے حد
کواکب ہیں کہ نگ چھوٹے بڑے ہیں
یہ ہیرے دستِ قدرت نے جڑے ہیں
نہ جانے توڑ کر اک سلکِ گوہر
کیے کس نے ہیں یہ موتی نچھاور
یہ کس کا جلوہ یارب گلفشاں ہے
کہ پا انداز فرشِ کہکشاں ہے
فلک پر جمع ہیں جنت کی حوریں
زمیں کے رہنے والے کیوں نہ گھوریں
ٹکے ہیں پردۂ شب میں ستارے
نشاط انگیز ہیں دل کش نظارے
کسی کی سیج پر بکھرے اِدھر پھول
تڑپ اٹھا اُدھر دلِ حسبِ معمول

کبھی اک خندۂ دنداں نما پر — گہرافشاں مسلسل دیدۂ تر
جراحت خیسۂ صحنِ باغِ گردوں — جوابِ سینۂ پُر داغِ گردوں
بساطِ چرخ پر تارے بچھے ہیں — کہ خاکستر پہ انگارے بچھے ہیں
ہے اندیشہ یہی آہِ رسا سے — دہک اٹھے نہ یہ اخگر ہوا سے
بجا عقدِ ثریا کو گلا ہے — کہ پہلو میں دلِ پُر آبلہ ہے
بنات النعش! کیوں غم ہو نہ تازہ — لئے ہو اپنے کاندھے پر جنازہ
خدا ہی جانتا ہے رازِ ہستی — وہ ہو انجام یا آغازِ ہستی
ہوئے ہیں جس غرض سے خلق اختر — کھلے وہ عقدۂ سربستہ کیوں کر
جو ہے دل میں کہو۔ کہہ دوں صفی ہیں — یہ شمعیں جس لئے روشن ہوئی ہیں

کریں تا ان مزاروں پر چراغاں
نہیں جن کا جہاں میں کوئی پرساں

ضامن الہ آبادی

سید ضامن علی ضامن ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ انگریزی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کرسچین کالج الہ آباد میں پروفیسر ہوئے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو ہیں۔ بچپن سے شاعری کی طرف مائل ہیں۔ الہ آباد کا ماہانہ مشاعرہ آپ کے دم سے قائم ہے۔ غزلیں نہایت اچھی لکھتے ہیں۔ اکثر غزلوں میں نظم کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ "شانِ آرزو" اسی طرح کی نظم ہے۔ کلام میں جذبات، سوز اور درد کی فراوانی ہے۔

شانِ آرزو

ہے فزوں حدِ بیاں سے عز و شانِ آرزو
سجدہ گاہِ دو جہاں ہے آستانِ آرزو

دل وہی جس کی کہ عظمت لامکاں سے کم نہیں
اصل میں دیکھو تو بس ہے اک مکانِ آرزو

دونوں عالم جس کو کہتے ہیں وہ دو ہی چیزیں ہیں
ایک جسمِ آرزو ہے ایک جانِ آرزو

ہاتھ میں کشکول رکھتی ہے فقیروں کے یہی
بادشہ کا سر ہے وقفِ آستانِ آرزو

آرزو تخلیق کی پیدا ہوئی اللہ کو
اس سے بڑھ کر کیا دکھائیں ہم کو شانِ آرزو

ظلمِ ظالم کیا ہے؟ اک خاموش حسرت کا وجود
نالۂ مظلوم کیا ہے؟ اک فغانِ آرزو

آرزوئیں نیک تھیں یا بد تھیں جانچے گا خدا
اصل میں دنیا ہے دار امتحانِ آرزو

خانۂ دل میں اسی کی روشنی ہی جلوہ گر
آرزو خود ہے ضیا بخشِ مکانِ آرزو

دفترِ عالم کا ماتم اک اک ورق دیکھو بغور
جتنے قصے ہیں وہ سب ہیں داستانِ آرزو

طور پر موسیٰ کریں دیدارِ خالق کا سوال
ساتھ دے میٹھی جسارت کا زبانِ آرزو

رام جی کیوں کھینچتے جا کر جنک جی کی کماں
دل میں گر ہوتا نہ تیر بے کمانِ آرزو

بے ستون اور بازوئے فرہاد سے نسبت تھی کیا
عقل میں آتی نہیں تاب و توانِ آرزو

ہزاروں سے بھی میدان جیتے اک نے سوا
پھیر دے ہمت کی جانب گر عنانِ آرزو

بے طلب سب دل میں آ جاتی ہیں قوتیں اور دیگر
ہمت و جوش و شجاعت میہمانِ آرزو

متحد گر آرزو ہو جائے اہلِ ملک کی
پھر بہار اپنی دکھائے گلستانِ آرزو

غم نہ کھانا چاہیے پکوان گر پھیکا رہا
یہ سمجھ لو تم کہ اونچی ہے دکانِ آرزو

جبر میں بھی یہ اگر اپنا دکھائیں اختیار
بند راہیں کھول دیں وابستگانِ آرزو

قوتیں مغلوب کر دیں بڑھ کے خود کمزوریاں
توپ کا گولہ بنے تیرِ کمانِ آرزو

کام کی کثرت سے ضامنؔ وقت ملتا ہی نہیں
چند گھنٹوں میں ہو گیا شرح بیانِ آرزو

مجاز

اسرارالحق مجازؔ ردولی ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے سیاست اور شاعری کی طرف متوجہ ہیں۔ اس لئے آپ کی شاعری میں موجودہ دَور کا سیاسی عنصر بہت غالب ہو گیا ہے۔ بندش پختہ استعارے اور تشبیہ نادر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ایک پیغام ہے اور یقین ہے کہ آپ کی شہرت میں اضافہ ہو گا۔

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دُلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی
پٹریوں پر دُور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کرتے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بدم
رفتہ رفتہ، اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی

سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی

اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی

اک بگولہ کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

رعشہ براندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی

یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

پل پہ دریا کے دمادم کوندتی، للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی

پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی

مرغزاروں کو دکھاتی جیسے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خود بخود روٹھی ہوئی بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

منہ میں گھستی ہی سرنگوں کے یکایک ڈر کر
دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی گاتی ہوئی

آگئے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

اک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی۔
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی

تیزی رفتار کے سکے جماتی جابجا
دشت و دَر میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی

ڈال کر گذرے مناظر پر اندھیری کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہد ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی

اک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی

اک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ تاریکیٔ شب کی اڑا کر دھجیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زمزمیں پیشانی صحرا میں ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی

ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی

وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی ڈھول بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

قطعات

جب ایک مضمون ایک شعر میں ادا نہ ہوا اور دو یا دو سے زائد شعروں میں کیا جائے تو ایسے شعروں کو اصطلاح میں قطعہ کہتے ہیں۔ ابتداءً قطعہ غزل اور قصیدوں کے سلسلہ میں لکھا جاتا تھا اب نظم کی شکل میں علیحدہ بھی لکھا جاتا ہے اور اکثر نئے شعرا نے اس صنف میں خامہ فرسائی کی ہے۔

قطعہ میں اشعار مسلسل ہوتے ہیں۔ جب قطعہ کسی مشہور شاعر کے مشہور شعر پر ختم ہوتا ہے تو اُسے تضمین کہتے ہیں شبلیؔ، اقبالؔ اور اکبرؔ کے قطعات بہت مشہور ہیں۔

اکبرؔ

اس سے قبل اکبرؔ کی شاعری کا تذکرہ ہو چکا ہے مختصراً یہاں یہ کہنا ہے کہ اکبرؔ نے قطعہ سے طویل نظموں کا کام لیا اور باوجود اختصار کے بیحد کامیاب ہوئے۔ صفائی، روانی اور رفعت ان کے قطعات کی جان ہیں۔ ظرافت کے پردے میں عجیب عجیب نکات حل کئے ہیں۔

جدید معاشرت

چاہا جو میں نے ان سے طریقِ عمل یہ واعظ — بولے کہ نظمِ ذیل کو ارقام کیجیے
پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ — خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے
بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم — تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے
یورپ میں پھر کے پیرس و لندن کو دیکھئے — تحقیقِ ملک کاشغر و شام کیجیے
ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن — خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے
رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر — دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے
سامان جمع کیجیے کوٹھی بنائیے — باصد خلوص دعوتِ حکام کیجیے
آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے — تزئینِ طاق و سقف و در و بام کیجیے
مذہب کا نام لیجیے عامل نہ ہوجیے — جو متفق نہ ہوا سے بدنام کیجیے
قومی ترقیوں کے مشاغل بھی ہیں ضرور — اس مد میں بھی ضرور کوئی کام کیجیے
بے رونقی سے کاٹئے کیوں اپنی عمر کو — کیوں انتظام گردشِ ایام کیجیے
لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے — مُردوں کے ساتھ قبر میں آرام کیجیے

ختمِ بہار

ختم کیا صبا نے رقصِ گل پہ نثار ہو چکی
جوشِ نشاط ہو چکا صوتِ ہزار ہو چکی

رنگِ بنفشہ مٹ گیا سنبلِ تر نہیں رہا
صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی

رت وہ جو تھی بدل گئی آئی بس اور نکل گئی
تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی

اب تک اسی روش پہ ہے اکبرِ مست و بے خبر
کہہ دے کوئی عزیزِ من فصلِ بہار ہو چکی

برگِ مضمحل

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو، تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دوں

شبلی نعمانی

مولانا شبلی شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں۔ ان کی شہرت ان کی نثر ان کی تاریخ دانی ان کی عالمانہ تحریر کی بدولت ہے۔ نظم میں فارسی سے شغف رکھتے تھے۔ اردو نظم میں قطعہ میں بیحد کامیاب ہوئے ہیں۔ روانی، سادگی فصاحت۔ بلاغت ان کے قطعات کی خصوصیات ہیں۔

عدلِ جہانگیری

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر — ایک دن "نور جہاں" بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا — گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا — خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہ جہاں گیر کو پہونچی جو خبر — غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی — جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا — میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں — مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ "بزن"
اُس کی گستاخ نگاہی نے کیا اسکو ہلاک — کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیِ دین سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا — کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیِ دین نے بھی بےخوف و خطر صاف کہا — شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے — پر جہاں گیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر — پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں — اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں "تیغ بزن"
وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں یہی — تھی جہاں گیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ — جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور — نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں — جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع — ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام — خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا — بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دیئے لاکھ درم بیگم نے — سب نے دربار میں کی عرض کہ اے "شاہِ زمن"
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص — قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقین — کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اُٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم — تھی جہاں نورجہاں معتکفِ بیتِ حزن
دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا — تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

مولوی وحید الدین سلیم

۱۸۶۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے عربی اور فارسی علم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کر لی، پھر طبابت شروع کی۔ اس کے بعد علی گڑھ چلے آئے اور کالج میں ملازمت کی۔ اس کے بعد مختلف اخباروں کی اڈیٹری کرتے رہے۔ پھر حیدرآباد گئے اور معزز عہدے حاصل کر کے ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا۔ زمیندار اخبار لاہور مولانا کی ذات سے چمکا اور انھیں کی بدولت ضبط بھی ہو گیا۔ نہایت دلچسپ و صاف گو بزرگ تھے۔ ان کے حالات مرزا فرحت اللہ بیگ نے بہت دلچسپ انداز میں لکھے ہیں:۔

سلیم کی تحریر اور تقریر موثر اور مدلل اور زوردار ہوتی تھی ساری زندگی ادب کی خدمت کرتے رہے اور اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے رہے۔ ان کی نثر اور نظم دونوں میں پاکیزگی، متانت، سادگی، رنگینی، شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ان کا انداز اچھوتا اور عنوانات نئے ہوتے تھے۔ حالی اور اقبال کے درمیان کی کڑی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حالی کی زبان میں وہ خیالات جو اقبال نے بعد کو اپنا لئے ادا کر جاتے ہیں تنقید نگاری اور وضع اصطلاحات میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔

دعوتِ انقلاب

کیا لے گا خاک، مردہ و افتادہ بن کے تو
طوفان بن کہ ہے تری فطرت میں انقلاب
کیوں ٹمٹمائے کرمک شب تاب کی طرح
بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب
وہ خاک ہو کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر
وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعل ناب
چڑیوں کی طرح دانہ پہ گرتا ہے کس لئے
پرواز رکھ بلند کہ تو بن سکے عقاب
وہ چشمہ بن کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں
رہ رو کو تو فریب نہ دے صورتِ سراب

اقبال

آپ کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے۔ قطعات میں جو جدت اقبال نے کی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ ان کی آخری نظمیں بالعموم قطعات ہیں۔ زندگی کے تمام مسائل فلسفیانہ انداز میں حل کئے گئے ہیں۔ ایجاز، بلاغت، بلندی آپ کے قطعات کی خصوصیات ہیں۔

طالبِ علم

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

نصیحت

بچہ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سال خورد　　اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام　　سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر　　وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

جاوید کے نام

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

ذوقِ نظر

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دل کشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکی شمشیر

رُباعیات

رباعی اصطلاحاً نظم کی وہ قسم ہے جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہو۔ اس میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرے مصرعہ کا قافیہ بالعموم علیحدہ ہوتا ہے۔ فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین ادا کرنے کے لئے یہ بہت موزوں ہے چنانچہ اردو شعرانے انھیں موضوعات کو رباعیات میں نظم کیا ہے اردو کے مشہور رباعی نگار انیسؔ، دبیرؔ اور حالیؔ ہیں۔

انیسؔ

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے — بے زادِ سفر کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک — یہ قبر کی منزل بھی بہت بھاری ہے

ہموار ہے، گر تو تجھ کو کچھ باک نہیں — سرکش ہے اگر تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تند خو کدورت کے سوا — دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں

راہی طرفِ عالمِ بالا ہوں میں — دُنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں
یارب تیرا نام پاک چلنے کے لئے — گویا اک ہڈیوں کا مالا ہوں میں

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے　رخ سب سے پھیر کے، منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے، تجھ سے سوؤں اے قبر　میں نے بھی تو جان دیکے پایا ہے تجھے

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے　کب تھمتے ہیں اشک جو ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے سخن کی تیری تاثیر انیس　رو دیتے ہیں مثل شمع، جلنے والے

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہے　ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا　چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہے

نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں　دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوئے دوستاں یکرنگ　کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

رتبہ جسے دنیا ہے خدا دیتا ہے　وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز، ثنا آپ اپنی　جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے　جھکتے ہیں قوی بھی، ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگدل ہوتے ہیں　دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

دبیرؔ

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے
عالم میں ہر اک کو تگ و دو تیری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہوں ضو تیری ہے

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

ادنیٰ ہے جو سر جھکائے اعلیٰ وہ ہے
جو خلق سے بہرہ ور ہے دریا وہ ہے
کیا خوب دلیل ہے یہ خوبی کی دبیرؔ
سمجھے جو بُرا آپ کو اچھا وہ ہے

حالیؔ

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

زہاد کو تو نے محو تمہید کیا
عشاق کو مست لذت دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کا ساجھی کوئی
توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

بطحا سے عرب کو محترم تو نے کیا
اور اُمیوں کو خبر اُمم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلے کو بہم تو نے کیا

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا
یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے پہ اتنی ہے خبر
اک مشغلۂ دلچسپ ہے بے کاروں کا

اکبر

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں
گو اس نے بہت کہا۔ کہا کچھ بھی نہیں
زلف و کمر بتاں کا مفقود ہے ذکر
شیطان پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تو دل سے ہم کو ستے ہیں مگر
کہ اُنکی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

آ مزا اگر ملے جو ہے نام و نمود میں
بکیا خرچ زندگی ہوا اگر حال زحمت میں
دوزخ کے داخلے میں نہیں انکو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جوان کا بہشت میں

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا
چاہی اصلاح تو خدا سے چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر
قسمت ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

ہر اک سے سنا نیا فسانا ہم نے
دیکھا دنیا میں اک زمانا ہم نے
اول یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز
آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ جانا ہم نے

جگت موہن لال رواں

آپ ۱۸۸۹ء میں بمقام اناؤ پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ سر سے بچپن ہی میں اُٹھ گیا تھا۔ بھائی نے پرورش کی۔ آپ نے وکالت پاس کرکے اُناؤ میں وکالت شروع کر دی۔

ادبی دنیا میں اُن کی شہرت اُن کی شاعری کی بدولت ہوئی۔ اور شاعری کی شہرت رباعیوں کی بدولت ہوئی۔ عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے جب ان کی شاعری کے شباب کا زمانہ آیا تو ۴۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

رواں کے کلام میں بلا کی اثر آفرینی ہے تمام اصنافِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے بہت زود گو اور پُر گو شاعر تھے۔ وہ رباعیات اور اخلاقی رباعیات کی فراوانی میں ممتاز ہیں۔ ان کی رباعیات میں تشبیہات و استعارات کا استعمال الفاظ کا دربست قابل تعریف ہوتا ہے۔

پابندی جان و دل ہے زنجیرِ حیات — اللہ اللہ ری فکرِ توقیرِ حیات
آغاز کی کچھ خبر نہ انجام کا علم — کونین سے پھر بھی محوِ تدبیرِ حیات

افلاس اچھا نہ فکرِ دولت اچھی — جو دل کو پسند ہو وہ دولت اچھی
جس سے اصلاحِ نفس ناممکن ہو — اُس عیش سے ہر طرح مصیبت اچھی

حرص و ہوس حیاتِ فانی نہ گئی — اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں — مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

آلودۂ معصیت ہے دامن میرا — جل جانے کا مستحق ہے خرمن میرا
بیکار ہے شکوۂ اہل دنیا کا رواں — بڑھ کر نہیں کوئی مجھ سے دشمن میرا

تابع ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے — آزادیٔ دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے باز آئے ہم — فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

15